ملک صفدر حیات (سیریز نمبر 24)
نیکی آباد
سسپنس ڈائجسٹ : اکتوبر 2014

نیکی آباد

ملک صفدر حیات

قدرت کے قانون میں ایک بات بہت نمایاں ہے... عمل کا ردِعمل... اور یہ عمل چاہے چھوٹا ہو یا بڑا، رائگاں کبھی نہیں جاتا... چاہے ساری عمر رائگانی کے عذاب میں تمام ہوجائے مگر کوئی لمحہ ردِعمل سے محفوظ نہیں۔ انہوں نے بھی جو بویا تھا ایک دن وہی کاٹنا تھا لیکن خوش قسمتی سے ان کے پاس کچھ ایسے بیج بھی تھے جن سے پھوٹنے والے پودے رفتہ رفتہ تناور درخت بنتے گئے اور ان کی گھنیری چھایا نے انہیں جلتی دھوپ سے بچالیا۔ تب انہیں احساس ہوا کہ انسان نادانی میں غلطیاں ہی نہیں کرتا بلکہ بے خبری میں کچھ نیکیاں بھی کرجاتا ہے جو دعا بن کر انہیں اپنے حصار میں لے لیتی ہیں... جس کا ادراک انسان کو بہت آخر میں ہوتا ہے۔ اسی لیے جانے انجانے میں نیکیاں کرتے رہنے کا سلسلہ جاری رہنا چاہیے۔ جانے کب اجر کی ضرورت پیش آجائے۔

ایک چھوٹی سی نیکی سے ملنے والے اجرِ عظیم کا ایک اثر انگیز واقعہ

ڈاکو اور چور میں کوئی زمین آسمان کا فرق نہیں ہوتا۔ دونوں ایک ہی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایک آنکھیں دکھا کر زور زبردستی سے لوٹ مار کرتا ہے، دوسرا آنکھیں بچا کر چپکے سے چرا لے جاتا ہے۔ یہ بھی چند ایسے ہی کرداروں کی کہانی ہے جو چور بھی تھے، ڈاکو بھی تھے اور ہلاکو بھی تھے......

ایک ابر آلود صبح میں تھانے میں بیٹھا اپنے فرائضِ منصبی ادا کررہا تھا کہ دو دیہاتی مجھ سے ملنے آئے۔ میں نے انہیں فوراً اپنے کمرے میں بلالیا۔ ان میں سے ایک کا نام اللہ رکھا اور دوسرے کا فیض محمد معلوم ہوا۔ دونوں کے چہروں سے پریشانی مترشح تھی۔ میں نے انہیں آرام سے بٹھایا اور باری باری دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''آپ لوگ کہاں سے آئے ہو؟''

''جناب! میرا تعلق فرید کوٹ سے ہے۔'' فیض محمد نامی آدمی نے بتایا پھر اپنے ساتھی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''اللہ رکھا ریلوے پھاٹک پر رہتا ہے۔''

فرید کوٹ میرے تھانے سے تھوڑے فاصلے پر ریلوے لائن کے کنارے واقع ایک چھوٹا سا گاؤں تھا اور ریلوے کا پھاٹک فرید کوٹ سے چند قدموں کی دوری پر تھا۔

ان دونوں کی حالت بتاتی تھی کہ کسی بہت بڑی مصیبت نے انہیں میرے پاس آنے پر مجبور کیا تھا۔

''اس برستی بارش میں پولیس کے پاس آنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟'' میں نے ایک بار پھر دونوں کے چہروں کا جائزہ لیتے ہوئے سوال کیا۔

''تھانے دار صاحب! اللہ رکھا کی لڑکی کو ڈاکوؤں نے اغوا کرلیا ہے......'' فیض محمد نے بتایا۔

میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور پوچھا۔ ''یہ کب کا واقعہ ہے؟''

''پچھلی رات کا جی......'' اس مرتبہ اللہ رکھا نے براہِ راست جواب دیا۔ ''کوئی آدھی رات کے وقت دو ڈاکو ہمارے کمرے میں گھس آئے۔ انہوں نے وہاں موجود ہر شے کو الٹ پلٹ کر رکھ دیا۔ یہ بات صاف نظر آرہی تھی کہ انہیں ہمارے کوارٹر میں کسی خاص چیز کی تلاش تھی۔ وہ اپنی مطلوبہ چیز کو ڈھونڈنے کے دوران میں صندل سے بار بار یہ بھی پوچھ رہے تھے کہ بتا جانے تمہیں جو نیلی پوٹلی دی تھی، وہ کہاں ہے؟ جب وہ اس تلاش میں ناکام رہے تو جاتے

ہوئے صندل کو اٹھا لے گئے۔ ہم سب دیکھتے ہی رہ گئے جناب......'' لمحاتی توقف کر کے اللہ رکھا نے ایک گہری سانس لی پھر گلوگیر آواز میں بولا۔

''پتا نہیں، میری صندل کا کیا حال ہوگا......؟''

صندل یقیناً اللہ رکھا کی بیٹی کا نام تھا جسے ڈاکو اٹھا لے گئے تھے۔ اللہ رکھا محکمۂ ریلوے کا ملازم تھا اور اس کی ڈیوٹی ریلوے پھاٹک پر تھی۔ وہ اپنی فیملی کے ساتھ پھاٹک کے نزدیک بنے ریلوے کوارٹر میں رہتا تھا۔ سب لوگ اسے ''پھاٹک والا'' کہتے تھے۔

''تمہارے کوارٹر میں کل کتنے افراد رہتے ہیں؟'' میں نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔

''میں، میری بیوی شگفتہ، صندل اور اس کا چھوٹا بیٹا سلطان......'' اس نے بتایا۔ ''اور...... صندل کو ڈاکو اٹھا لے گئے ہیں۔''

''جب ڈاکو تمہاری بیٹی کو اٹھا رہے تھے، تم لوگوں نے مزاحمت نہیں کی......؟''

''مزاحمت کیا کرتے سرکار'' وہ بے بسی سے بولا۔ ''وہ دونوں مسلح تھے۔ انہوں نے ہمیں خطرناک بندوقوں کے نشانے پر رکھ کر یہ کارروائی کی ہے۔''

''اگر وہ ڈاکو تمہارے سامنے لائے جائیں تو تم انہیں پہچان لوگے؟'' میں نے اللہ رکھا کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ایک اہم سوال کیا۔

''نہیں جناب۔'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''ان دونوں نے اپنے چہروں کو چھپانے کے لیے ڈھاٹے لگا رکھے تھے۔''

''یہ تاجا کون ہے......'' میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔ ''اور نیلی پوٹلی کا کیا قصہ ہے؟''

''آپ مجھ سے، بڑی سے بڑی قسم لے لیں جناب۔'' وہ منت ریز لہجے میں بولا۔ ''میں نہ تو کسی تاجا کو جانتا ہوں اور نہ ہی نیلی پوٹلی کے بارے میں مجھے کچھ پتا ہے۔''

''لیکن......'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''ان ڈاکوؤں نے بڑی شدت کے ساتھ تمہاری بیٹی سے پوچھا تھا کہ...... تاجا نے تمہیں جو نیلی پوٹلی دی تھی وہ کہاں ہے...... پوچھا تھا کہ نہیں؟''

''جی بالکل پوچھا تھا۔'' وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''نہ صرف پوچھا تھا بلکہ اس منحوس پوٹلی کی تلاش میں ہمارے کوارٹر کی ہر شے اوپر نیچے کردی تھی۔''

''اس سے ظاہر ہوتا ہے......'' میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''تمہاری بیٹی صندل کسی تاجا نامی بندے کو اچھی طرح جانتی ہے......''

''یہ بھی تو ہوسکتا ہے جناب کہ ڈاکوؤں کو شدید قسم کی غلط فہمی ہو گئی ہو۔'' اللہ رکھا کا ساتھی فیض محمد ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

''ہاں، ایسا ہوسکتا ہے۔'' میں نے سر کو اثباتی جنبش دی۔ ''مگر اس کے امکانات ایک فیصد سے زیادہ نہیں۔ ڈاکوؤں نے پچھلی رات جس سرگرمی سے وہاں کارروائی کی ہے اور نیلی پوٹلی بازیاب نہ ہونے پر وہ صندل کو اٹھا لے گئے تھے اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ انہیں یقین تھا، کسی تاجا نے صندل کو کوئی نیلی پوٹلی دی تھی......''

''آپ صندل کو ڈاکوؤں کے قبضے سے نکالیں تو پھر ہی حقیقت کھل کر سامنے آئے گی۔'' اللہ رکھا بھیگی ہوئی آواز میں بولا۔

''ابھی تم نے تھوڑی دیر پہلے مجھے بتایا ہے کہ تم دونوں میاں بیوی کے علاوہ صندل اور اس کا بیٹا سلطان بھی تمہارے ساتھ رہتا ہے۔'' میں نے معاملے کے ایک اہم پہلو کی جانب اشارہ کرتے ہوئے سوال کیا۔ ''کیا صندل تم لوگوں سے ملنے آئی ہوئی تھی یا وہ مستقل طور پر ادھر ہی رہتی تھی؟''

''جی وہ پچھلے ایک سال سے ہمارے پاس ہی رہ رہی ہے۔'' وہ دکھی لہجے میں بولا۔

''کیوں...... اس کا گھر والا کہاں ہے؟''

''نیاز علی نے ایک سال پہلے صندل کو طلاق دے دی تھی۔'' اللہ رکھا نے بتایا۔ ''جب سے وہ ہمارے پاس ہی ہے۔''

''اوہ......!'' میں نے ایک گہری سانس خارج کی اور پوچھا۔ ''اس طلاق کا کوئی خاص سبب تھا؟''

''ساس بہو کے اختلافات۔'' اس نے جواب دیا۔ ''صندل کی اپنی ساس فضیلت سے ایک دن نہیں بنی تھی۔ دو تین سال لڑائی جھگڑے میں گزر گئے اور پھر کوئی ایک سال پہلے فضیلت صندل کو طلاق دلوانے میں کامیاب ہو ہی گئی۔''

''نیاز علی کے صندل کے ساتھ کیسے تعلقات تھے؟''

''نہ اچھے اور...... نہ برے!'' وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔ ''نیاز اپنی ماں کی بہت سنتا تھا اگر اس میں ذرا سی بھی عقل ہوتی تو وہ صندل کو طلاق دے کر اپنے گھر سے نہ نکالتا لیکن...... وہی بات ہے کہ وہ ماں کی بات کو ٹال نہیں سکتا تھا۔ جو دو ڈھائی سال صندل نے جمال پور میں، نیاز علی کے ساتھ گزارے بھی تو اس میں صندل کی برداشت اور تحمل کا

ہاتھ تھا۔ اس کی جگہ اگر کوئی اور لڑکی ہوتی تو شادی کے دوسرے دن ہی واپس میکے آجاتی......"

"اللہ رکھا! یہ تو ہوتا ہے۔" میں نے ہمدردی بھرے لہجے میں کہا۔ "جو شوہر اپنی ماں کے اتنے زیادہ فرماں بردار ہوتے ہیں کہ اس اطاعت گزاری میں وہ اپنی بیوی کے حقوق بھول جاتے ہیں، ان کا انجام کچھ اسی قسم کا ہوتا ہے۔"

"نیاز علی تو اتنا بے حس اور پتھر دل نکلا ہے کہ اس ایک سال میں اسے اپنے بیٹے کی بھی یاد نہیں آئی۔" وہ کڑوے انداز میں بولا۔ "طلاق کے وقت بھی اس نے جھوٹے منہ بھی ایک بار یہ نہیں کہا تھا کہ وہ سلطان کو اپنے پاس رکھے گا۔"

"ہاں...... بعض لوگ ایسے ہی شقی القلب ہوتے ہیں۔" میں نے سرسری انداز میں کہا پھر پوچھا۔ "رات والی کارروائی میں کہیں نیاز علی کا ہاتھ تو نہیں......؟"

"میرا نہیں خیال کہ اس اغوا میں نیاز علی کا ہاتھ ہو۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ "باقی...... آپ کی تفتیش ہی سے صحیح صورت حال کا پتا چلے گا۔"

"تفتیش......!" میں نے گمبھیر انداز میں کہا پھر پوچھا۔ "تم لوگ تھانے کیسے پہنچے ہو...... میرا مطلب ہے، کس سواری سے؟"

"جی...... ہم تانگے میں بیٹھ کر آئے ہیں۔" فیض محمد نے جواب دیا۔

"تانگا چھوڑ دیا یا......؟"

"باہر کھڑا ہے جناب۔" میری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی اللہ رکھا بول اٹھا۔ "ہم اسی میں واپس جائیں گے۔"

"ٹھیک ہے۔ آپ لوگ تھوڑی دیر کے لیے باہر برآمدے میں بیٹھو۔" میں نے تسلی آمیز انداز میں کہا۔ "میں بھی چلتا ہوں تم لوگوں کے ساتھ......"

وہ میرا شکریہ ادا کرنے کے بعد کمرے سے نکل گئے۔

☆☆☆

جب ہم ریلوے پھاٹک تک پہنچے تو ہلکی بارش کا سلسلہ رک چکا تھا۔ یہ بارش آج علی الصباح ہی شروع ہوئی تھی۔ وہ فروری کا مہینا تھا۔ موسم سرما رخصت ہو رہا تھا تاہم پچھلے چند روز سے جو گاہے بگاہے ہلکی اور کبھی تیز بارش ہونے لگی تھی اس نے جاتی ہوئی سردیوں کو پیچھے سے آواز دے کر کچھ عرصے تک مزید روک لیا تھا۔ فضا میں موجود خنکی لطف اندوز ہونے کی دعوت دیتی تھی۔ میں نے تھانے سے نکلتے ہوئے کانسٹیبل ناصر کو بھی اپنے ساتھ لے لیا تھا۔

ریلوے لائن کے ساتھ قدرے نشیب میں ایک مخصوص طرز کا سرکاری کوارٹر نظر آرہا تھا جیسا کہ پھاٹک کے پاس عموماً بنے ہوتے ہیں۔ اللہ رکھا اپنی مختصر سی فیملی کے ساتھ اس کوارٹر میں رہتا تھا۔ اس کی ڈیوٹی، ٹرینوں کی آمدورفت کے اوقات میں پھاٹک کو بند کرنا اور ٹرینوں کو دن میں سبز جھنڈی اور رات میں سبز بتی دکھانا تھا۔ وہ اپنے شب و روز سے مطمئن تھا کہ اچانک اس پر ایک افتاد ٹوٹ پڑی۔ دو نامراد ڈاکوؤں نے اس کے گھر میں خاصی افراتفری مچائی تھی اور اپنے مقصد میں ناکامی کے بعد وہ اللہ رکھا کی بیٹی صندل کو اٹھا کر اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ راستے میں اللہ رکھا نے مجھے بتایا تھا کہ دونوں ڈاکو گھوڑوں پر سوار ہو کر وہاں پہنچے تھے۔

میں نے پندرہ بیس منٹ تک نہایت ہی توجہ کے ساتھ اللہ رکھا کے کوارٹر کا جائزہ لیا۔ گھریلو سامان اور مختلف اشیا کی افراتفری سے یہ بخوبی اندازہ ہوتا تھا کہ ڈاکوؤں کو وہاں کسی بہت ہی قیمتی اور اہم شے کی تلاش تھی اور وہ شے نیلی پوٹلی کے سوا اور کچھ نہیں تھی۔ ڈاکوؤں کے جارحانہ استفسار کی روشنی میں مذکورہ پوٹلی کسی تاجا نامی شخص نے صندل کو دی تھی لیکن اللہ رکھا کسی تاجا یا نیلی پوٹلی کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔

صندل کا بیٹا سلطان تین، سوا تین سال کا ایک خوب صورت اور گول مٹول بچہ تھا۔ وہ حالات کی سنگینی سے کماحقہ آگاہ نہیں تھا لہٰذا کھیل کود میں مصروف تھا۔ جائے وقوعہ کا تفصیلی جائزہ لینے کے بعد میں اللہ رکھا کی بیوی سلمٰی سے بات چیت کرنے لگا۔ اللہ رکھا اپنی پھاٹک والی ڈیوٹی میں مصروف ہو گیا تھا۔ اس وقت تھوڑے تھوڑے وقفے سے تین پسنجر اور دو مال گاڑیاں وہاں سے گزرتی تھیں اور ہر گاڑی کی آمد سے چند منٹ پہلے پھاٹک بند کرنا اس کے فرائضِ منصبی کا حصہ تھا۔ وہ ایک کچی سڑک جس پر ریلوے پھاٹک بنا ہوا تھا، زیادہ مصروف نہیں تھی۔ اِکا دُکا بیل گاڑیاں، تانگے یا سائیکل سوار وہاں سے گزرا کرتے تھے یا پھر ڈھور ڈنگر کی لمبی قطاریں۔ بہرحال، پھاٹک بند کر کے آنے والی گاڑی کو ہری جھنڈی یا ہری بتی دکھانا اس کا فرض تھا۔ محکمۂ ریلوے اسی کام کی اسے تنخواہ دیتا تھا۔

سلمٰی بی بی ادھیڑ عمر کی ایک قبول صورت عورت تھی۔ بیٹی کے اغوا پر ظاہر ہے، وہ بھی بہت افسردہ اور دل شکستہ تھی۔ میں نے اس سے دلی ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

''سلمیٰ! تم لوگوں کے ساتھ رات جو بھی واقعہ پیش آیا اس کا مجھے بہت دکھ ہے۔ میری کوشش ہو گی کہ جلد از جلد تمہاری بیٹی کو ڈھونڈ نکالوں لیکن اس کام کے لیے مجھے آپ کے تعاون کی اشد ضرورت ہو گی۔''

''ہم ہر قسم کے تعاون کے لیے تیار ہیں تھانے دار صاحب......'' وہ روہانسی آواز میں بولی۔ ''آپ کسی بھی طرح میری صندل کو واپس لے آئیں۔''

''انشا اللہ! وہ بہت جلد تمہاری آنکھوں کے سامنے ہو گی۔'' میں نے تسلی آمیز انداز میں کہا پھر پوچھا۔ ''سلمیٰ! تم ان ڈاکوؤں کے بارے میں کیا جانتی ہو؟''

''جی...... وہ دو تھے۔'' اس نے بتایا۔ ''آدھی رات کو گھوڑوں پر سوار ہو کر یہاں پہنچے تھے۔ دونوں کے پاس بندوقیں تھیں اور انہوں نے ڈھاٹوں میں اپنے چہرے چھپا رکھے تھے۔ بہت ہی ظالم اور وحشی تھے...... بس، میں اس سے زیادہ ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔''

''یہ سب تو تمہارا خاوند اللہ رکھا مجھے بتا چکا ہے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میں ان ڈاکوؤں کی شناخت کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں تاکہ ان تک پہنچنے میں مجھے آسانی حاصل ہو۔''

''نہیں جی......'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ''ایسی تو کوئی بات ہمیں پتا نہیں۔''

''اللہ رکھا نے مجھے جو حالات بتائے ہیں، ان سے تو یہی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ڈاکو تمہاری بیٹی صندل کو اچھی طرح جانتے تھے۔'' میں نے سلمیٰ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ ''انہوں نے کسی تاجا اور نیلی پوٹلی کا بھی ذکر کیا تھا۔ ان کے مطابق انہیں کسی نیلی پوٹلی کی تلاش تھی جو تاجا نے صندل کو دی تھی۔''

''جی، آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' سلمیٰ نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''جب صندل نے ان کے سوال کا جواب نہیں دیا اور نیلی پوٹلی سے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا تو انہوں نے منحوس پوٹلی کی تلاش میں ہمارا پورا گھر الٹ کر رکھ دیا۔ آپ نے ہمارے سامان کی حالت دیکھی ہے نا۔''

''ہاں دیکھی ہے۔'' میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی۔ ''اس افراتفری سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ وہ نیلی پوٹلی ان کے لیے بہت اہمیت کی حامل تھی۔ جب وہ پوٹلی تلاش کرنے میں ناکام رہے تو تمہاری بیٹی کو اٹھا لے گئے......''

''جی، وہ نامراد میری صندل کو اٹھا لے گئے......'' وہ گلوگیر آواز میں بولی۔

''وہ لوگ جاتے ہوئے آپ کو کوئی دھمکی وغیرہ دے کر گئے تھے؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں جی...... ہمیں تو کوئی دھمکی نہیں دی پر......''

''پر کیا......؟'' وہ بولتے بولتے اٹکی تو میں نے فوراً پوچھ لیا۔

''جناب! جب وہ صندل کو گھوڑے پر لاد رہے تھے تو ان میں سے ایک نے کہا تھا......'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ''ہمارے پاس اتنا ٹائم نہیں کہ یہاں بیٹھ کر تم سے سوال جواب کریں۔ تاجا کے پاس پہنچ کر خود ہی تمہاری زبان کھل جائے گی۔''

سلمیٰ کی زبان سے یہ ایک اہم انکشاف ہوا تھا۔ میں نے اضطراری لہجے میں استفسار کیا۔ ''اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ ڈاکو صندل کو تاجا کے پاس لے کر گئے ہیں؟''

''سوہنا رب ہی بہتر جانتا ہے جی۔'' وہ آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''ہم نے تو تاجا کا نام پہلی بار ڈاکوؤں کی زبان سے سنا ہے۔ پتا نہیں، بیٹھے بٹھائے ہم کس مصیبت میں پھنس گئے ہیں۔''

''ایک بات تو طے ہے سلمیٰ بی بی!'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''آپ لوگوں کو پتا ہو یا نہ ہو لیکن صندل ضرور کسی تاجا کو جانتی ہے۔ کسی غلط فہمی کی بنا پر وہ لوگ آدھی رات کو ایسی کارروائی نہیں کر سکتے اور جہاں تک اس نیلی پوٹلی کا تعلق ہے تو......'' میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس خارج کی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''وہ بھی کوئی فرضی کہانی نہیں۔ صندل جانتی ہو یا نہیں جانتی ہو مگر نیلی پوٹلی کا اپنا ایک وجود ضرور ہے جو ڈاکوؤں کے مطابق تاجا نے صندل کو دی تھی۔''

''میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھانے دار صاحب کہ یہ کیا چکر ہے۔'' وہ بے بسی سے بولی۔

''سب چکر سمجھ میں آجائے گا اگر تاجا کا سراغ مل جائے تو۔'' میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اپنے ذہن پر زور دو سلمیٰ بی بی...... تاجا تک پہنچے بغیر تمہاری بیٹی سلمیٰ کو واپس نہیں لایا جا سکتا......''

''ذہن پر کیا زور دوں جی؟'' وہ پریشانی سے بولی۔ ''یہ نام پہلے کبھی سنا ہی نہیں۔''

میں نے صندل کی سسرال کے حوالے سے بھی گھما پھرا کر مختلف سوالات کیے لیکن کام کی کوئی بات سامنے نہ آسکی۔ سلمیٰ کا خیال بھی اللہ رکھا کے ذہن کی عکاسی کرتا

دکھائی دیا تھا کہ گزشتہ رات والے افسوسناک واقعے میں صندل کے سابق شوہر نیاز علی یا اس کے گھر والوں کا کوئی ہاتھ نہیں ہوسکتا تھا۔

''جس وقت ڈاکوؤں نے تمہارے کوارٹر پر یلغار کی، تم لوگوں نے چیخنے چلّانے یا لوگوں کو مدد کے لیے پکارنے کی کوشش نہیں کی تھی؟'' میں نے پوچھا۔

''پہلی بات تو یہ جناب کہ ہم مسلح ڈاکوؤں کو دیکھ کر دہشت میں آگئے تھے۔'' اس نے جواب دیا۔ ''اور اگر ہم چیخ چلا کر کسی کو مدد کے لیے پکارتے بھی تو کون آتا۔ آپ دیکھ رہے ہیں نا، یہاں قریب میں کوئی آبادی وغیرہ بھی تو نہیں......''

اس کی بات میں اچھا خاصا وزن تھا۔ آج کل کی طرح اس زمانے میں شہری یا دیہی آبادی میں اس قدر پھیلاؤ نہیں آیا تھا۔ میں اس وقت جس ریلوے پھاٹک پر کھڑا تھا وہاں سے نزدیک ترین آبادی موضع فرید کوٹ تھی جو اللہ رکھا کے کوارٹر سے لگ بھگ آدھے میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ فیض محمد کا تعلق موضع فرید کوٹ ہی سے تھا جو اللہ رکھا کے ساتھ اس افسوس ناک واقعے کی رپورٹ درج کرانے تھانے پہنچا تھا۔

میں نے سلمٰی سے پوچھا۔ ''رات کو جس وقت ڈاکو یہاں کارروائی کر رہے تھے، صندل کا بیٹا کہاں تھا...... کیا یہ سارا تماشا اس معصوم بچے نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا؟''

''سلطان اس وقت سو رہا تھا۔'' اس نے جواب دیا۔ ''اس نے کچھ بھی نہیں دیکھا ورنہ اسے سنبھالنا مشکل ہوجاتا۔ یہ صندل کو نہ پاکر خاصا اداس تو ہے لیکن ابھی تک اس نے ہنگامہ مچانے کی کوشش نہیں کی۔''

''تمہیں بڑی توجہ سے اس کا خیال رکھنا ہوگا۔'' میں نے گمبھیر انداز میں کہا۔ ''یہ مچل گیا تو تمہارے لیے بڑی مشکل ہوجائے گی۔''

''مجھے یقین ہے، میں اسے سنبھال لوں گی۔'' وہ بڑے اعتماد سے بولی۔ ''یہ پچھلے ایک سال سے میری ہی گود میں پل رہا ہے۔ صندل اس کی ماں ضرور ہے لیکن اس کا زیادہ تر وقت میرے پاس ہی گزرتا ہے۔''

''یہ تو بہت اچھی بات ہے۔'' میں نے دور کھیلتے سلطان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''آپ دعا کرو، میں جلد از جلد صندل کو بازیاب کرنے میں کامیاب ہوجاؤں۔''

''آمین......!'' اس نے تہ دل سے کہا۔

ہمارے درمیان گفتگو کا سلسلہ جاری ہی تھا کہ اللہ رکھا بھی آگیا۔ اس نے آکر بتایا۔ ''اب دو گھنٹے تک ادھر سے کسی گاڑی کا گزر نہیں ہوگا لہٰذا میں فارغ ہی ہوں۔''

میں نے اللہ رکھا سے بھی مختلف سوالات گھما پھرا کر کیے لیکن ایسی کوئی بات سامنے نہ آسکی جس کے سہارے میں ان دو ڈاکوؤں کے تعاقب میں روانہ ہوسکتا۔ ان لوگوں نے ڈاکوؤں کے چہرے نہیں دیکھے تھے۔ وہ انہیں آواز سے بھی نہیں پہچانتے تھے۔ نیلی پوٹلی اور تاجا کے حوالے سے بھی انہوں نے اپنی مکمل لاعلمی کا اظہار کیا تھا۔ میں نے ان حالات کی روشنی میں اللہ رکھا سے پوچھا۔

''تم نے یہ تو دیکھا ہوگا کہ وہ ڈاکو کس طرف گئے تھے؟''

''جی ہاں۔'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی اور ایک جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''وہ لوگ اس طرف اندھیرے میں گم ہوگئے تھے......''

اللہ رکھا نے جس سمت اشارہ کیا تھا، یہ وہی کچی سڑک تھی جس پر ریلوے پھاٹک بنا ہوا تھا۔ مذکورہ سڑک مشرق سے مغرب یا مغرب سے مشرق کی طرف جاتی تھی اور اللہ رکھا نے دونوں ڈاکوؤں کو مغرب کی جانب جاتے دیکھا تھا۔ وہ دونوں گھوڑوں پر سوار تھے اور اللہ رکھا کی بیٹی صندل کو بھی اپنے ساتھ اٹھا لے گئے تھے۔

سمت کا تعین تو ہوگیا تھا لیکن علی الصباح ہونے والی بارش نے تفتیشی مراحل میں خاصی پیچیدگی پیدا کردی تھی۔ میں گھوڑوں کے کھرے کی مدد سے ڈاکوؤں کی تلاش کا کام جاری نہیں رکھ سکتا تھا۔

میں تانگے میں بیٹھ کر اس کچی سڑک پر کافی آگے تک گیا لیکن کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ ڈاکو کس طرف گئے ہوں گے۔ مذکورہ سڑک کی دونوں جانب سرسبز و شاداب کھیتوں کا سلسلہ تاحد نگاہ پھیلا دکھائی دیتا تھا۔ یہ واردات پچھلی رات کو پیش آئی تھی۔ کم و بیش اس واقعے کو بارہ گھنٹے گزر چکے تھے۔ اب تک تو وہ ڈاکو پتا نہیں، کہاں سے کہاں پہنچ چکے ہوں گے۔ فوری طور پر ان کے خلاف کوئی بھی عملی کارروائی ممکن نہیں تھی۔ وہ آج کل کا تیز رفتار زمانہ نہیں تھا کہ میں فون کھڑکا کر اردگرد کے علاقوں کو چوکنا کر دیتا۔ بہرحال، میری سوچ صرف دو نکات پر رک سی گئی تھی۔ نمبر ایک، تاجا...... نمبر دو، نیلی پوٹلی!

اگر ان دونوں میں سے کسی ایک کے بارے میں بھی معلومات حاصل ہوجاتیں تو میں بہ آسانی ان ڈاکوؤں تک پہنچنے کی کوشش کرسکتا تھا۔ بارش نے سارا کام خراب کردیا تھا ورنہ میں کھوجی کی مدد سے یہ ضرور جان لیتا کہ وہ نامراد ڈاکو کدھر سے آئے تھے اور کہاں گئے تھے۔

تمام تر صورتِ حال کا جائزہ لینے کے بعد میں نے تسلی بخش لہجے میں اللہ رکھا سے کہا۔ ”زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں انشاءاللہ! بہت جلد تمہاری بیٹی کو بازیاب کرلوں گا۔“

”اللہ آپ کی زبان مبارک کرے جناب۔“ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

”لیکن اس کے ساتھ ساتھ تمہیں بھی ایک کام کرنا ہوگا۔“ میں نے کہا۔

وہ سوالیہ نظر سے مجھے تکنے لگا۔

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں وضاحت کردی۔ ”اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھو اور کسی طرح بھی یہ جاننے کی کوشش کرو کہ ”تاجا“ اور ”نیلی پوٹلی“ کا کیا قصہ ہے۔ اگر اس راز سے پردہ اٹھ گیا تو پھر یہ بھی پتا چل جائے گا کہ وہ ڈاکو کون لوگ تھے اور وہ تمہاری بیٹی صندل کو کہاں لے گئے ہیں۔“

”جی اچھا...... میں پتا چلانے کی کوشش کرتا ہوں۔“ وہ کمزور سی آواز میں بولا۔

میں نے پوچھا۔ ”صندل کے علاوہ بھی وہ ڈاکو تمہارے گھر سے کچھ اٹھا لے گئے ہیں؟“

”نہیں جی...... کچھ بھی نہیں۔“ وہ نفی میں گردن جھٹکتے ہوئے بولا۔

”اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ یہاں کسی نیلی پوٹلی کی تلاش میں آئے تھے۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”جو ان کے خیال میں کسی تاجا نے صندل کو دی تھی۔ سلمٰی نے یہ بھی بتایا تھا کہ وہ ڈاکو جاتے ہوئے یہ کہہ گئے ہیں کہ وہ لوگ صندل کو تاجا کے پاس لے کر جارہے ہیں......؟“

”جی......“ اللہ رکھا نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ”انہوں نے یہ بات کی تھی۔“

”اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ تاجا ان کے قبضے میں ہے۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”ان کی اصل دشمنی تاجا سے ہے اور یہ دشمنی کسی نیلی پوٹلی کی وجہ سے ہے۔ ان کا یہ خیال ہے کہ تاجا نے نیلی پوٹلی صندل کو دی تھی۔ یقیناً یہ بات تاجا ہی نے انہیں بتائی ہوگی۔ وہ صندل کے دشمن نہیں ہیں۔ اگر مذکورہ نیلی پوٹلی انہیں حاصل ہوجائے تو وہ صندل کو چھوڑ دیں گے۔“

”جناب! آپ کی ساری بات میری سمجھ میں آرہی ہے۔“ اللہ رکھا نے دھیمی آواز میں کہا۔ ”لیکن مسئلہ تو نیلی پوٹلی اور تاجا کا ہے نا...... ہم نہ تو کسی تاجا کو جانتے ہیں اور نہ ہی کسی نیلی پوٹلی کا ذکر سنا ہے۔“

بولتے بولتے اللہ رکھا کی آواز جھرجھرا گئی تھی۔ میں نے اس کا کندھا تھپتھپایا اور ہمدردی بھرے لہجے میں کہا۔

”اللہ رکھا! مجھے تمہاری بات کا یقین ہے۔ میں تو یہ کہہ رہا ہوں کہ تم تاجا اور نیلی پوٹلی کے بارے میں جاننے اور سراغ لگانے کی کوشش کرو۔ میں بھی ان ڈاکوؤں کا کھوج لگانے کی کوشش کرتا ہوں۔ اللہ کے حکم سے تمہاری بیٹی جلد ہی مل جائے گی۔“

”اللہ آپ کا بھلا کرے تھانے دار صاحب!“ وہ امید بھری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”میں آپ کے حکم کے مطابق ضرور کوشش کروں گا۔“

میں اللہ رکھا کو تسلی دلاسا دے کر واپس آگیا۔

☆☆☆

اگرچہ میں اللہ رکھا اور اس کی بیوی سلمٰی کو یہ یقین دلا آیا تھا کہ میں بہت جلد ان کی بیٹی صندل کو ڈھونڈ نکالوں گا لیکن سچی بات یہ ہے کہ مجھے ڈاکوؤں تک رسائی حاصل کرنے کے لیے کوئی راستہ نظر نہیں آرہا تھا۔ میری سوچ کی تان گھوم پھر کر ”تاجا“ اور ”نیلی پوٹلی“ پر ہی ٹوٹتی تھی۔ میرا ذاتی تجربہ اس واردات کے بارے میں کچھ اس طرح تھا۔

وہ دو ڈاکو جو تاحال نامعلوم تھے ان کی صندل سے کسی قسم کی دشمنی نہیں تھی۔ ان کا اصل شکار تاجا نامی کوئی شخص تھا جو اس وقت ان کے قبضے میں تھا۔ وہ تاجا سے کسی نیلی پوٹلی کو حاصل کرنا چاہتے تھے۔ مذکورہ نیلی پوٹلی میں یقیناً کوئی نہایت ہی قیمتی شے مثلاً طلائی زیورات یا کوئی تگڑی نقدی موجود تھی۔ اس بات کے امکانات بھی موجود تھے کہ تاجا نے جھوٹ بولا ہو۔ اپنی جان چھڑانے کے لیے اس نے صندل کا نام لے دیا ہو۔ کچھ بھی تھا لیکن ایک بات کا مجھے سو فیصد یقین تھا کہ اللہ رکھا کی مغوی بیٹی صندل کسی تاجا کو ضرور جانتی تھی۔

جب میں تھانے پہنچا تو بارش کا سلسلہ ایک بار پھر تھم چکا تھا۔ ہلکی پھلکی بوندا باندی ہورہی تھی۔ موسم میں اگرچہ اچھی خاصی خنکی موجود تھی لیکن میری نظر میں یہ بڑا خوشگوار اور رومانٹک موسم تھا۔

اس ڈرامائی بارش کی وجہ سے اگرچہ کھرے کھوج کا کوئی امکان تو باقی نہیں رہا تھا لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں تھا کہ میں ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جاتا۔ یہ کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا۔ میرے تھانے کی حدود میں سے گزشتہ رات دو ڈاکوؤں نے ایک عورت کو اغوا کرلیا تھا۔ میں مغوی کی بازیابی تک سکون کی سانس کیسے لے سکتا تھا۔

وقوعہ سے نزدیک ترین تین گاؤں واقع تھے۔ نصف میل شمال میں ریلوے کی پٹڑی کے ساتھ موضع فرید کوٹ، مشرق میں کچے راستے کے کنارے، ریلوے پھاٹک سے لگ بھگ دو میل کے فاصلے پر موضع شاہ پور اور مغربی سمت تین میل کی دوری پر جمال پور۔ جمال پور وہی گاؤں تھا جہاں صندل بھی بیاہ کر گئی تھی اور پھر ایک سال پہلے طلاق لے کر واپس آ گئی تھی۔

میں نے اپنے عملے کے تین ہوشیار قسم کے اہلکاروں کو سادہ لباس میں معلومات حاصل کرنے کے لیے ان تینوں موضعات کی جانب روانہ کر دیا۔ انہیں نہایت ہی احتیاط کے ساتھ کسی تاجا نامی شخص کے بارے میں پتا چلانا تھا یا کسی ایسے بندے کا سراغ لگانا تھا جو اپنے علاقے سے پراسرار طور پر غائب ہو گیا ہو۔ میرا ذہن اس زاویے پر بھی سوچ رہا تھا کہ عین ممکن ہے، ڈاکوؤں نے جس شخص کو "تاجا" کہا، درحقیقت اس کا نام کوئی اور ہو......

تین اہلکاروں کو برستی بارش میں تین مختلف گاؤں کی سمت روانہ کرنے کے بعد بھی مجھے چین نہیں آیا تھا۔ میرا ذہن مسلسل اس معمے کو حل کرنے میں مصروف تھا۔ ڈاکوؤں نے صندل کو گھوڑے پر لادنے کے بعد جس طرف کا رخ کیا تھا، وہ سمت بھی میری سوچ میں تازہ تھی۔ یہ وہ کچا راستہ یا کچی سڑک تھی جو کھیتوں کے بیچوں بیچ مشرق سے مغرب کی جانب چلی جا رہی تھی اور انتہائی مغرب میں جا کر یہ کچی سڑک چک چون نامی ایک گاؤں کی زمین پر ختم ہو جاتی تھی تاہم چک چون جائے وقوعہ سے لگ بھگ بیس میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ اس بات کے زیادہ امکانات نہیں تھے کہ ڈاکو صندل کو چک چون لے کر گئے ہوں گے۔ میرے اندازے کے مطابق انہوں نے بیچ میں کہیں اپنا راستہ بدل لیا ہوگا کیونکہ ایک ڈاکو کا یہ کہنا کہ...... وہ صندل سے باقی کی پوچھ گچھ تاجا کے سامنے کریں گے، اس امر کا ثبوت فراہم کرتا تھا کہ تاجا کو انہوں نے جائے وقوعہ سے زیادہ فاصلے پر نہیں رکھا ہوگا۔ یہاں پر ایک بات کا خاص طور پر ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ چک چون ایک سرحدی گاؤں تھا۔ اس کی دوسری جانب دوسرے ضلع کی حدود شروع ہو جاتی تھی۔ میرا ابھی چک چون جانا تو نہیں ہوا تھا۔ یہ گاؤں میرے تھانے کی حدود میں بھی نہیں آتا تھا البتہ یہ بات میرے علم میں تھی کہ چک چون میں چودھری حیات اللہ کی عملداری تھی۔

جہاں میں نے اپنے تھانے کی حدود کی اتنی زیادہ تفصیلات بیان کر دی ہیں، وہاں یہ بھی بتاتا چلوں کہ اس کچے راستے کے متوازی، جنوب مشرق سے شمال مغرب کی سمت ایک نہر بھی رواں دواں تھی۔ یہ کچی سڑک مشرق میں نہر سے ذرا ہٹ کر تھی لیکن مغرب میں آگے جا کر نہر کے اوپر سے گزر کر قدرے ترچھی ہو کر سرحدی گاؤں تک چلی گئی تھی۔ گویا اس پل کے بعد نہر اور کچی سڑک کے درمیان فاصلہ بتدریج بڑھتا چلا گیا تھا۔ جائے وقوعہ پر یعنی ریلوے پھاٹک کے مقام پر نہر اور کچی سڑک میں کم و بیش ایک فرلانگ کا فاصلہ حائل تھا۔ جائے وقوعہ سے لگ بھگ تین میل آگے جا کر ایک پل کی مدد سے سڑک، نہر کے اوپر سے گزر جاتی تھی۔ میرا خیال ہے، اس تفصیل کے بعد اس علاقے کا نقشہ آپ کے ذہن میں محفوظ ہو گیا ہوگا۔

دوپہر کے بعد بارش ایک مرتبہ پھر رک سی گئی۔ بہت ہی ہلکی پھلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ میں اپنے کمرے سے نکل کر تھانے کے احاطے میں ٹہلنے لگا۔ اس دوران میں میرا ذہن مسلسل صندل کے اغوا کے بارے میں ہی سوچ رہا تھا۔

شام سے تھوڑی دیر پہلے وہ اہلکار واپس آ گیا جسے میں نے تاجا کی "تلاش" میں فرید کوٹ بھیجا تھا۔ مذکورہ اہلکار نے مجھے جو رپورٹ دی اس کے مطابق فرید کوٹ میں تاجا نامی کوئی شخص رہائش پذیر نہیں تھا۔ کانسٹیبل نے مجھے یہ بھی بتایا کہ فرید کوٹ میں رہنے والے افراد میں سے کوئی کم نہیں تھا۔ وہاں سب امن و امان چل رہا تھا البتہ صندل کے اغوا والی بات سے پورا فرید کوٹ آگاہ ہو چکا تھا۔ میرے لیے یہ کوئی اچنبھے کی بات نہیں تھی کیونکہ آج صبح اللہ رکھا کے ہمراہ جو شخص صندل کے اغوا کی رپورٹ درج کرانے آیا تھا اس کا تعلق موضع فرید کوٹ ہی سے تھا۔

اگلی صبح بڑی چمکیلی مگر خوشگوار تھی۔ آج آسمان پر دور دور تک بادلوں کا نام و نشان دکھائی نہیں دیتا تھا۔ میں اپنے کمرے میں آ کر بیٹھا ہی تھا کہ شاہ پور جانے والا کانسٹیبل لوٹ آیا۔ وہ اپنے ساتھ وہاں کے ایک رہائشی کبیر احمد کو بھی لے کر آیا تھا۔ میں نے فوراً دونوں کو اپنے پاس بلا لیا۔ کانسٹیبل نے مجھے جو تفصیلات بتائیں ان کے مطابق کبیر احمد کا بیٹا پچھلے دو دن سے غائب تھا البتہ "تاجا" کے بارے میں شاہ پور سے بھی کوئی سن گن نہیں مل سکی تھی۔

کبیر احمد کی عمر پینتالیس اور پچاس کے درمیان نظر آتی تھی۔ وہ پستہ قامت اور دوہرے بدن کا مالک تھا جس کے کندھے معمولی سے اوپر کو اٹھے ہوئے تھے۔ میں نے کانسٹیبل کو باہر جانے کا اشارہ کیا اور کبیر احمد کی جانب متوجہ

ہوگیا۔

"تمہارے بیٹے کا نام کیا ہے کبیر احمد؟" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"اسلم جی......" اس نے جواب دیا۔ "لیکن سب اسے "اچھو" کہتے ہیں جناب۔ وہ میرے بڑھاپے کا سہارا تھا۔ پتا نہیں، کہاں چلا گیا......" بولتے بولتے اس کی آواز رندھ گئی۔

"وہ دو دن سے غائب ہے۔" میں نے کبیر احمد کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "تم نے ابھی تک اس کی گمشدگی کی رپورٹ درج کیوں نہیں کرائی؟"

"ایک آدھ دن کے لیے تو وہ پہلے بھی اِدھر اُدھر ہوجایا کرتا تھا۔" اس نے بتایا۔ "اس لیے میں نے اس کی زیادہ پروا نہیں کی...... اور اب تو دو دن ہوگئے ہیں۔"

"کبیر احمد! تم نے تھوڑی دیر پہلے بتایا ہے کہ اچھو تمہارے بڑھاپے کا سہارا ہے۔" میں نے کہا۔ "کیا اس کے علاوہ تمہاری کوئی اولاد نہیں......؟"

"جی نہیں......" اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ "بس ہم دونوں ہی اِدھر شاہ پور میں ایک ساتھ رہتے ہیں۔"

"اور تمہاری بیوی وغیرہ......؟" میں نے اس کی طرف سوالیہ انداز میں دیکھا۔

"جناب! میں نے تو شادی ہی نہیں کی۔" وہ بے ساختہ بول اٹھا۔

"کیا مطلب؟" میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ "جب شادی نہیں کی تو بیٹا کہاں سے آگیا؟"

"وہ جی...... میرا بنایا ہوا بیٹا ہے......"

"بنایا ہوا...... مطلب منہ بولا؟"

"جی ہاں۔" اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔

"گویا تم نے اپنے کسی رشتے دار کی اولاد کو بیٹا بنایا ہوا ہے؟" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "تمہیں اس کے والدین سے جاکر پوچھنا چاہیے تھا۔ ہوسکتا ہے، پچھلے دو دن سے وہ اپنے سگے ماں باپ کے پاس ہو۔"

"نہیں جی، ایسا نہیں ہوسکتا۔" وہ خاصی فکرمندی سے بولا۔ "اس کا کوئی عزیز رشتے دار اس دنیا میں نہیں ہے۔"

"اوہ......!" میں نے ایک گہری سانس خارج کی پھر پوچھا۔ "کبیر احمد! وہ تمہارے ہتھے کیسے چڑھ گیا تھا؟"

"جناب! یہ کوئی ایک سال پہلے کی بات ہے۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "شاہ پور میں ہر سال میلا لگتا ہے۔ وہ مجھے میلے میں ملا تھا۔ جلد ہی وہ میرے بہت قریب آگیا۔ ہمارے درمیان اچھی خاصی ہم آہنگی ہوگئی۔ اس کے پاس ہنر تھا مگر رہنے کا ٹھکانا نہیں تھا۔ میرے پاس شاہ پور میں ایک چھوٹا سا گھر ہے مگر کوئی مستقل آمدنی کا ذریعہ نہیں۔ اچھو نے مجھ سے کہا کہ اگر میں اسے اپنے گھر رہائش کی جگہ دے دوں تو وہ مجھے رزق روزگار سے بالکل بے نیاز کردے گا۔ کمائے گا وہ، کھائیں گے ہم دونوں......"

"ہوں......" میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ "اچھو کے پاس کمائی کا ایسا کون سا ہنر تھا؟"

"تھانے دار صاحب! وہ سموسے، پکوڑے اور آلو لڈو کھٹائی والے بنانے کا ماہر ہے۔" کبیر احمد نے بتایا۔ "وہ صبح چھابڑی لے کر گھر سے نکل جاتا تھا اور دن ڈھلنے پر واپس آتا تھا۔ آس پاس کے گاؤں دیہات میں گھوم پھر کر اپنا تیار کردہ سامان بیچتا تھا۔ وہ یہاں آپ کے علاقے تک بھی آتا ہے۔ اچھو کو پیدل چلنے کا بہت شوق ہے۔"

"ٹھیک ہے کبیر احمد۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "تم دو میل کا سفر طے کرکے میرے پاس آئے ہو۔ میں اچھو کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرلیتا ہوں۔ تم مطمئن ہوکر واپس جاؤ۔ میں جلد از جلد اسے ڈھونڈ نکالنے کی کوشش کروں گا۔"

"آپ ضرور اچھو کی گمشدگی کی رپورٹ درج کریں تھانے دار صاحب۔" وہ میرے کمرے میں اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے بولا۔ "لیکن ابھی میں آپ کے پاس ایک خاص مقصد سے آیا ہوں۔"

اس کی آنکھوں اور چہرے کے تاثرات سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس کے ذہن میں اچھو کی گمشدگی سے بھی زیادہ اہم کوئی چیز موجود تھی۔ میں نے آنکھیں سکیڑ کر اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔

"کون سا خاص مقصد کبیر احمد؟"

"آپ کا جو آدمی کسی تاجا کی تلاش میں شاہ پور گیا تھا میں نے اسے بھی اپنے مقصد کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔" وہ نہایت ہی رازداری سے بولا۔ "سنا ہے، یہاں پھاٹک والے کی لڑکی کو ڈاکوؤں نے اغوا کرلیا ہے......"

"تم نے بالکل ٹھیک سنا ہے کبیر احمد......" میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔ "اللہ رکھا کی بیٹی صندل کو ڈاکوؤں نے واقعی اغوا کرلیا ہے اور میرے اندازے کے مطابق تاجا جانتا ہے کہ صندل کو کیوں اغوا کیا گیا ہے......"

لمحاتی توقف کرکے میں نے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے اسے صندل کے اغوا کی تفصیل سے آگاہ

کر دیا۔

پوری توجہ سے اس نے میری بات سنی اور میرے خاموش ہونے پر بولا۔ ”یہ تو بہت بُرا ہوا جناب۔“

”ہاں واقعی...... بہت بُرا ہوا۔“ میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی پھر پوچھا۔ ”تم نے ابھی تک اپنے مقصد کی وضاحت نہیں کی۔ کیا تمہارے پاس تاجا یا صندل کے حوالے سے کچھ معلومات ہیں؟“

”میں یقین سے تو کچھ نہیں کہہ سکتا تھانے دار صاحب۔“ وہ اپنی جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے بولا۔ ”میں آپ کو ایک چیز دکھاتا ہوں جی۔“

تھوڑی ہی دیر کے بعد کبیر احمد نے پوسٹ کارڈ سائز کی ایک تصویر نکال کر میری جانب بڑھا دی۔ میں نے مذکورہ تصویر اس کے ہاتھ سے لی اور اس پر نظر جما دی۔ وہ پچیس سے تیس سال تک کی ایک عورت کی تصویر تھی۔ میں نے نگاہ اٹھا کر کبیر احمد کی طرف دیکھا اور پوچھا۔

”کون ہے یہ؟“

”میں اس عورت کو بالکل نہیں جانتا۔“ وہ سپاٹ آواز میں بولا۔

”یہ تصویر تمہیں کہاں سے ملی ہے؟“ میں نے پوچھا۔ ”اور مجھے دکھانے کا آخر مقصد کیا ہے؟“

”میرا خیال ہے، آپ اس تصویر کی مدد سے اچھو کو تلاش کر سکتے ہیں۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ”یہ مجھے اچھو کے سامان سے ملی ہے۔“

”اوہ......“ میں نے ایک بوجھل سانس خارج کی۔ ”اس کا مطلب ہے، تمہارا اچھو اس عورت کے ساتھ پیار کی پینگیں چڑھا رہا تھا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ اس عورت کو بھگا لے گیا ہو......؟“

”مجھے بھی اسی چیز کا خدشہ ہے جناب۔“ وہ سنسنی خیز لہجے میں بولا۔ ”لیکن اس بات کا مجھے یقین ہے، یہ عورت شاہ پور کی رہنے والی نہیں۔ آپ کو تصویر دینے کا مقصد یہ ہے کہ آپ اسے اپنے آس پاس کے علاقوں میں تلاش کرنے کی کوشش کریں۔ وہ سارا دن چھابڑی اٹھائے نگر نگر گھومتا رہتا تھا۔ پتا نہیں، کہاں کس کے ساتھ ٹانکا فٹ ہو گیا ہو۔“

”ہاں کبیر احمد، یہ تم نے اچھی راہ سجھائی ہے۔“ میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ”تم اس تصویر کو میرے پاس چھوڑ جاؤ۔ اگر یہ پتا چل گیا کہ یہ کون ہے، کہاں کی رہنے والی ہے تو اس کی مدد سے اچھو کو ڈھونڈنے میں کافی آسانی ہو جائے گی۔“

کبیر احمد نے میرا شکریہ ادا کیا اور دوبارہ آنے کا کہہ کر تھانے سے رخصت ہو گیا۔ میں موجودہ صورتِ حال پر غور و فکر کرنے لگا۔

صندل کے اغوا اور ڈاکوؤں کے حوالے سے نیلی پوٹلی اور تاجا والا معاملہ ابھی حل نہیں ہوا تھا کہ کبیر احمد اچھو کی گمشدگی کا قصہ لے کر آ گیا تھا۔ جو تصویر اچھو کے سامان میں سے نکلی تھی، اس عورت کا یقیناً اچھو کے ساتھ کوئی جذباتی تعلق رہا ہوگا۔ اگر میں تصویر والی عورت تک پہنچ جاتا تو اس کی مدد سے اچھو کا سراغ لگایا جا سکتا تھا۔ بہر حال، اچھو کی گمشدگی سے کہیں زیادہ اہم معاملہ صندل کے اغوا کا تھا جس کے حوالے سے تا حال کوئی سرا ہاتھ نہیں آیا تھا۔ اب مجھے اس پولیس اہلکار کی واپسی کا انتظار تھا جسے میں نے موضع جمال پور کی طرف روانہ کیا تھا۔

☆☆☆

دوپہر سے تھوڑی دیر پہلے فیض محمد میرے پاس آیا۔ یہ بندہ موضع فرید کوٹ کا رہنے والا تھا اور اللہ رکھا کا دوست بھی تھا۔ میں نے اسے فوراً اپنے پاس بلا لیا اور رسمی علیک سلیک کے بعد پوچھا۔

”فیض محمد! اور کیا خبریں ہیں؟“

”خبریں اچھی نہیں ہیں جناب۔“ وہ اپنے لہجے میں اداسی سموتے ہوئے بولا۔ ”اللہ رکھا کی حالت بہت خراب ہے۔ میں اسی کے کہنے پر آپ سے ملنے آیا ہوں جی۔ وہ اپنی بیٹی صندل کے لیے بہت پریشان ہے۔“

”میں بڑی شدومد سے صندل اور ان نامراد ڈاکوؤں کا سراغ لگانے کی کوشش کر رہا ہوں۔“ میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ ”ان شاء اللہ! میں بہت جلد اس مقصد میں کامیاب ہو جاؤں گا۔“

”اللہ آپ کی زبان مبارک کرے جی......!“ وہ خلوصِ دل سے بولا۔

میں نے ایک فوری خیال کے تحت پوچھ لیا۔ ”فیض محمد! تم کسی اچھو کو جانتے ہو؟“

”اچھو......!“ وہ گہری سوچ میں پڑ گیا۔ ”کیا یہ بندہ فرید کوٹ کا رہنے والا ہے؟“

”فرید کوٹ کا نہیں، شاہ پور کا۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”وہ جو چھابڑی اٹھائے آلو لڈو کھٹائی والے بیچتا پھرتا تھا......؟“

”اچھا اچھا...... وہ اچھو۔“ وہ جلدی سے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”اس اچھو کو تو میں کیا، پورا علاقہ

جانتا ہے۔ اس کے سموسے اور آلو لڈو کھٹائی والے بہت چٹ پٹے اور مزے کے ہوتے ہیں۔ میں نے خود کئی بار لے کر کھائے ہیں.....'' وہ لمحے بھر کے لیے رکا پھر ٹٹولنے والی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔

''اچھو کو کیا ہوا جناب..... آپ نے ایسا کیوں کہا کہ وہ آلو لڈو کھٹائی والے بیچتا پھرتا تھا۔ کہیں وہ......؟''

''وہ پچھلے دو دن سے غائب ہے۔'' میں نے فیض محمد کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''ابھی تھوڑی دیر پہلے اچھو کا باپ کبیر احمد شاہ پور سے میرے پاس آیا تھا، اس کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرانے۔''

میں نے کبیر احمد کا جان بوجھ کر ذکر کیا تھا تاکہ یہ جان سکوں کہ آیا فیض محمد اس حقیقت سے آگاہ ہے یا نہیں کہ اچھو، کبیر احمد کا سگا بیٹا نہیں تھا لیکن فیض محمد نے اس حوالے سے کسی خاص ردِعمل کا اظہار نہیں کیا اور سوچتے ہوئے لہجے میں بولا۔

''اچھو بھلا کہاں گم ہو سکتا ہے۔ میں نے دو تین دن پہلے بھی اس سے آلو لڈو کھٹائی والے لے کر کھائے تھے بلکہ..... یہ اسی دن کی بات ہے جب صندل کو اغوا کیا گیا ہے۔ یعنی جس دن میں نے اچھو سے آلو لڈو کھٹائی والے لیے تھے اس آنے والی رات میں صندل کو اغوا کیا گیا تھا۔''

''مجھے پتا چلا ہے.....'' میں نے فیض محمد کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ایک چال چلی۔ ''اچھو اکیلا ہی گم نہیں ہوا.....''

''اکیلا گم نہیں ہوا۔'' اس نے حیرت بھری نظر سے مجھے دیکھا۔ ''اس بات کا کیا مطلب ہے جی......؟''

''مطلب یہ کہ وہ اپنے ساتھ ایک عورت کو بھی بھگا لے گیا ہے۔'' میں نے بدستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اور اس عورت کا تعلق تمہارے گاؤں فرید کوٹ سے ہے......''

''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں جناب۔'' وہ اچھل پڑا۔ ''آپ کس عورت کا ذکر کر رہے ہیں..... فرید کوٹ سے تو کوئی بھی عورت غیر حاضر نہیں۔ اگر ایسا کوئی معاملہ ہوتا تو میں کیسے بے خبر رہ سکتا تھا......؟''

''اس عورت کی تصویر ہے میرے پاس۔'' میں نے اپنی میز کی جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''ہو سکتا ہے، دیکھ کر تم اسے پہچان جاؤ۔''

میں نے اپنی میز کی دراز سے وہ تصویر نکال لی جو کبیر احمد نے مجھے دی تھی، پھر میں نے مذکورہ تصویر کو فیض محمد کی جانب بڑھا دیا۔ اس نے میرے ہاتھ سے تصویر لے کر دیکھی تو اچھل پڑا۔ بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔

''یہ...... یہ تو صندل ہے...... اللہ رکھا کی بیٹی......''

اس کے انکشاف نے مجھے بھی ہلا کر رکھ دیا۔ میں نے چبھتی ہوئی نظر سے اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ''فیض محمد! کیا تمہیں یقین ہے کہ یہ اسی صندل کی تصویر ہے جسے ڈاکوؤں نے اللہ رکھا کے کوارٹر سے اغوا کر لیا ہے؟''

''جناب! اس میں یقین ہونے یا نہ ہونے کی کون سی بات ہے۔'' وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ ''اللہ رکھا کی ایک ہی لڑکی ہے اور میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں۔ اس کا نام صندل ہے اور یہ اسی صندل کی تصویر ہے۔ اگر آپ کو......'' وہ لمحے بھر کے لیے تھما، ایک گہری سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''اگر آپ کو مجھ پر اعتبار نہ ہو تو آپ اللہ رکھا سے اس امر کی تصدیق کر سکتے ہیں۔''

''اس سے تو میں بڑی ٹھیک ٹھاک تصدیق کروں گا۔'' میں نے اضطراری لہجے میں کہا۔ ''لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ صندل کی تصویر اچھو کے پاس پہنچی کیسے؟''

''تھانے دار صاحب! اچھو پھیری لگا کر گھر گھر آلو لڈو کھٹائی والے اور سموسے وغیرہ بیچا کرتا تھا۔'' وہ اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''اللہ رکھا کے گھر والے بھی اس سے چٹ پٹی اور مسالے دار چیزیں لے کر کھاتے تھے۔ ہو سکتا ہے..... آپ میرا مطلب سمجھ رہے ہیں نا......؟''

''جان لو کہ میں انتہائی ناسمجھ تھانے دار ہوں۔'' میں نے فیض محمد کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تمہارے ذہن میں جو بھی ہے صاف الفاظ میں مجھے بتاؤ۔''

''آپ ناسمجھ نہیں ہیں جناب۔'' وہ ٹھوس انداز میں بولا۔ ''بہرحال، میرے کہنے کا مطلب یہ ہے جی کہ..... ہو سکتا ہے، اچھو اور صندل میں کسی قسم کا ربط ضبط پیدا ہو گیا ہو اور صندل نے اپنی تصویر خود اسے دی ہو۔ آپ تو جانتے ہیں، سال ڈیڑھ سال پہلے صندل کی طلاق ہو گئی تھی۔ میں نے ایک دو بار صندل اور اچھو کو کھڑے باتیں کرتے ہوئے بھی دیکھا تھا۔ عین ممکن ہے کہ ان کے بیچ پیار محبت کا کوئی سلسلہ چل نکلا ہو۔''

فیض محمد کی بات میں اچھا خاصا وزن تھا۔ ایسا ہو جانا عین فطری بات تھی۔ صندل نے ایک مرد کی صحبت میں شادی شدہ زندگی کے چند سال گزارے تھے۔ اگر اس کا رجحان

اچھو کی طرف ہوگیا تھا تو اس میں اچنبھے والی کوئی بات نہیں تھی۔

میں نے آواز دے کر ایک کانسٹیبل کو اپنے پاس بلالیا۔ جب وہ میرے سامنے پہنچ کر باادب، باملاحظہ، ہوشیار کھڑا ہوگیا تو میں نے تحکمانہ انداز میں کہا۔

''وہ جو پھاٹک والا اللہ رکھا ہے نا...... اسے بلالاؤ۔''

''جو حکم ملک صاحب۔'' کانسٹیبل نے فرماں برداری سے کہا۔

''اور سنو......'' وہ جانے لگا تو میں نے کہا۔

وہ رک گیا اور سوالیہ نظر سے مجھے تکنے لگا۔ میں نے کہا۔

''اس سے پوچھ لینا کہ گاڑیوں وغیرہ کی آمد کے کیا اوقات ہیں۔ اگر ابھی اس کا وہاں سے ہلنا ممکن نہ ہو تو اس سے کہنا، شام سے پہلے کسی وقت بھی تھانے آکر مجھ سے مل لے۔''

''جی...... بہت بہتر......'' یہ کہہ کر کانسٹیبل کمرے سے نکل گیا۔

فیض محمد مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ''تھانے دار صاحب! اس وقت اللہ رکھا فارغ ہی ہوگا۔ اب دو بجے سے پہلے کوئی گاڑی ادھر سے نہیں گزرے گی۔''

میں نے رسٹ واچ پر نگاہ ڈالی۔ دو بجنے میں ابھی سوا دو گھنٹے باقی تھے۔ اس کا مطلب تھا، اللہ رکھا بہ آسانی تھانے کا چکر لگا کر واپس اپنی ڈیوٹی پر جاسکتا تھا۔ میں نے فیض محمد کی طرف دیکھتے ہوئے سنجیدہ لہجے میں پوچھا۔

''مجھے اس علاقے کے تھانے میں تعینات ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا لیکن تم تو سدا سے یہیں کے رہنے والے ہو۔ کیا یہاں پہلے بھی ڈاکوؤں نے اس قسم کی کوئی واردات کی ہے جیسی اللہ رکھا کے گھر میں ہوئی ہے؟''

''نہیں جناب......'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''فرید کوٹ اور آس پاس کے گاؤں میں کبھی ڈکیتی یا اغوا کی واردات نہیں ہوئی۔''

''تم فرید کوٹ کے گردونواح میں پائے جانے والے گاؤں دیہات میں بھی اکثر جاتے ہوگے۔'' میں نے ایک خاص مقصد کی خاطر سوال کیا۔ ''اور وہاں پر رہنے والے لوگوں سے بھی اچھی طرح واقف ہوگے؟''

''سارے گاؤں تو دیکھے بھالے ہیں جناب۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''لیکن وہاں بسنے والے تمام لوگوں سے واقفیت کا دعویٰ نہیں کرسکتا۔''

''شاہ پور تو جانا ہوتا ہے نا......'' میں نے فیض محمد کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میں آلو لدّو کھٹائی والے اچھو کے گاؤں کی بات کررہا ہوں؟''

''جی بالکل۔ وہاں تو جانا ہوتا ہے۔'' اس نے متذبذب لہجے میں جواب دیا پھر مجھ ہی سے سوال کردیا۔ ''اگر میں غلطی نہیں کررہا جناب تو...... آپ اچھو کے بارے میں مجھ سے کوئی خاص بات پوچھنا چاہتے ہیں۔''

''تمہارا اندازہ بالکل درست ہے فیض محمد۔'' میں نے اثبات میں گردن ہلائی پھر پوچھا۔ ''تم اچھو کو کب سے جانتے ہو؟''

''یہی...... کوئی سال بھر سے۔'' اس نے بتایا۔

''اور اس کے باپ کبیر احمد کو؟''

''جی، میں سمجھا نہیں۔'' وہ الجھن زدہ انداز میں مجھے دیکھنے لگا۔ ''آپ مجھ سے کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟''

''یہی کہ اچھو کے باپ کبیر احمد کو کب سے جانتے ہو؟'' میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

''اس بندے سے تو میرا کبھی واسطہ نہیں رہا جناب۔'' اس نے بتایا۔ ''اس لیے جاننے کا دعویٰ نہیں کرسکتا۔ دو چار بار دیکھا ہے اسے۔''

''کیا تمہیں اس بات کا یقین ہے کہ اچھو کبیر احمد ہی کا بیٹا ہے؟'' میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''جی، کیا مطلب ہے آپ کا۔'' وہ بوکھلاہٹ آمیز نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ ''ابھی آپ ہی نے تو بتایا ہے کہ کبیر احمد اپنے بیٹے اچھو کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرانے آپ کے پاس آیا تھا اور...... صندل کی تصویر بھی اسی نے دی ہے؟''

''میں نے تم سے کچھ بھی غلط نہیں کہا فیض محمد۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''لیکن حقیقت اس سے خاصی مختلف ہے۔''

''جی......!'' وہ حیرت بھرے انداز میں مجھے دیکھنے لگا۔ ''حقیقت کیا مختلف ہے جناب؟''

''اچھو، کبیر احمد کا سگا بیٹا نہیں۔'' میں نے انکشاف انگیز لہجے میں کہا۔

''یہ...... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں...... جناب!'' اس کی حیرت دوچند ہوگئی۔

''میں بالکل ٹھیک کہہ رہا ہوں فیض محمد!'' میں نے ٹھوس انداز میں کہا۔

جب اسے میری بات کا یقین نہ آیا تو میں نے کبیر احمد سے حاصل شدہ معلومات کا خلاصہ اسے سنا دیا۔ اس نے پوری توجہ سے میری بات سنی اور میرے خاموش ہونے پر بولا۔

''یہ تو آپ بڑی عجیب کہانی سنا رہے ہیں جناب......!''

''کہانی عجیب ہے یا غریب...... اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں نے جو بھی تمہیں بتایا ہے وہ سو فیصد سچ ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے کبیر احمد خود یہ انکشاف کر کے گیا ہے کہ اچھو لگ بھگ ایک سال سے اس کے ساتھ رہ رہا تھا اور یہ کہ وہ اس کا سگا بیٹا نہیں۔''

''جناب! میں تو صرف اتنا جانتا تھا کہ اچھو شاہ پور کا رہنے والا ہے۔'' وہ اپنی پیشانی کو سہلاتے ہوئے بولا۔ ''اور بڑے لذیذ آلو لڈو کھٹائی والے بناتا ہے۔ اس سے زیادہ مجھے کچھ پتا نہیں تھا۔''

''میں تم سے، اس سے زیادہ کچھ پوچھوں گا بھی نہیں، تم خوامخواہ پریشان ہونے کی کوشش نہ کرو۔'' میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ''اس وقت یہ بات زیادہ اہم نہیں کہ اچھو، کبیر احمد کا سگا بیٹا تھا یا نہیں۔''

''پھر کون سی بات اہم ہے جی؟'' وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

''اچھو اچانک کہیں غائب ہو گیا ہے، اپنی چھابڑی سمیت۔'' میں نے سنجیدہ انداز میں وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''اس کے ایک دن بعد اللہ رکھا کی بیٹی صندل کو دو ڈاکوؤں نے رات کی تاریکی میں اغوا کر لیا...... یہ کہیں ایک ہی سلسلے کی کڑیاں تو نہیں ہیں فیض محمد؟''

''سوہنا رب ہی بہتر جانتا ہے جناب......'' وہ سادگی سے بولا۔

''سوہنا رب تو ہمیشہ سب سے بہتر ہی جانتا ہے اور اس میں کسی شک وشبے کی گنجائش تلاش نہیں کی جاسکتی فیض محمد۔'' میں نے پورے اعتماد سے کہا۔ ''لیکن اس نے سوچنے اور سمجھنے کے لیے ہمیں بھی دماغ دیا ہے لہٰذا ہم بھی بہت کچھ جان سکتے ہیں۔ میں تم سے یہ ساری باتیں اس لیے کر رہا ہوں کہ تم مجھے ایک بھلے مانس انسان اور اللہ رکھا کے سچے ہمدرد نظر آئے ہو۔ تم بھی یہی چاہتے ہو گے کہ اللہ رکھا کی بیٹی جلد از جلد بازیاب ہو جائے......؟''

''بالکل جناب!'' وہ جلدی سے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''آپ نے تو میرے دل کی بات کہہ دی ہے۔ مجھے تو یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے میری اپنی بیٹی کو ڈاکوؤں نے اغوا کر لیا ہو۔''

''اللہ رکھا کے لیے تمہارے اخلاص کو تو میں نے پہلے دن ہی محسوس کر لیا تھا۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''اس تصویر کی بنا پر اچھو اور صندل کے درمیان کسی سنجیدہ رابطے کا تو سراغ مل گیا ہے۔ میں تمہارے سامنے اللہ رکھا سے اس حوالے سے پوچھ گچھ کروں گا لیکن تم اپنے طور پر بھی علیحدگی میں اسے کریدنے کی کوشش کرنا۔ یہ نہایت ہی اہم معاملہ ہے۔''

''آپ بے فکر ہو جائیں جناب۔'' وہ خاصے مضبوط لہجے میں بولا۔ ''میں اللہ رکھا کو کرید کر حقیقت اگلوا لوں گا۔''

''اگر اچھو صندل سے ایک دن پہلے اچانک غائب نہ ہو گیا ہوتا تو اسے شامل تفتیش کر کے بہت کچھ اگلوایا جاسکتا تھا۔'' میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''لیکن اب تو یہ معاملہ خاصا پیچیدہ ہو گیا ہے۔'' میں نے لمحے بھر کے لیے توقف کیا تو فیض محمد سوالیہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا تاہم اس نے منہ سے ایک لفظ نہیں نکالا۔ میں نے اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''پیچیدہ بھی اور خاصا خطرناک بھی...... اللہ رکھا اور اس کی گھر والی سلمٰی صندل کے کسی بھی مرد کے ساتھ تعلقات کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ دوسری جانب ڈاکوؤں کے الفاظ بھی تمہیں یاد ہوں گے...... وہ صندل کو اٹھا کر لے جانے کی نیت سے اللہ رکھا کے کوارٹر میں نہیں گھسے تھے بلکہ انہیں کسی نیلی پوٹلی کی تلاش تھی جو ان ڈاکوؤں کے مطابق تاجا نامی کسی شخص نے صندل کو دی تھی۔ صندل نے جب تاجا اور نیلی پوٹلی سے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا تو وہ یہ کہتے ہوئے اسے اپنے ساتھ لے گئے تھے کہ باقی کی پوچھ گچھ وہ صندل کو تاجا کے سامنے بٹھا کر کریں گے جس کا واضح مطلب یہی تھا کہ تاجا اس وقت ان کے قبضے میں تھا......''

''تھانے دار صاحب......!'' فیض محمد نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''کہیں یہ اچھو اور تاجا ایک ہی شخص کے دو نام تو نہیں؟''

''ایسا ہو سکتا ہے۔'' میں نے ستائشی نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ''کیونکہ کبیر احمد بھی اچھو کے ماضی سے پوری طرح واقف نہیں۔ ممکن ہے، اس کے پاس آنے سے پہلے وہ تاجا ہی ہو۔''

''یہ تو بڑا ہی الجھا ہوا معاملہ نظر آ رہا ہے جناب......!'' فیض محمد کے چہرے پر فکرمندی جھلکنے لگی۔

''ہاں، ابھی تک تو الجھا ہوا ہی ہے۔'' میں نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ ''لیکن میں بہت جلد اس معاملے کو سلجھا لوں گا۔''

ادھر میری بات ختم ہوئی، ادھر مجھے اللہ رکھا کی آمد کی اطلاع دی گئی۔ میں نے فوراً اسے اپنے پاس بلا لیا۔ اس نے میرے پاس پہنچ کر ادب سے مجھے سلام کیا۔ میں نے اسے

بیٹھنے کے لیے کہا۔ وہ ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ فیض محمد کو پہلے سے میرے پاس موجود پا کر وہ ایک لمحے کے لیے چونکا ضرور تھا تاہم اس نے کچھ کہنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔

''اور سناؤ اللہ رکھا۔ تمہاری ڈیوٹی کیسی چل رہی ہے؟''

''ڈیوٹی تو ڈیوٹی ہے جناب!'' وہ پژمردہ سی آواز میں بولا۔ ''ہر حال میں کرنی ہے۔ نہ تو ٹرینیں رک سکتی ہیں اور نہ ہی میری ڈیوٹی، چاہے دنیا میں کچھ بھی ہوتا رہے......''

بات کے اختتام پر اس نے اپنی آنکھوں کے نم ہوتے گوشوں کو ہاتھ کی پشت سے صاف کیا اور امید بھری مگر شکستہ نظر سے مجھے تکنے لگا۔ میں نے اس کی نگاہ کے مفہوم کو بہت گہرائی تک پڑھ لیا اور تسلی بخش لہجے میں کہا۔

''اللہ رکھا! مایوسی گناہ ہے۔ اس کی رحمت سے ہر حال میں امید رکھنا چاہیے، وہ بڑا نکتہ نواز ہے۔''

''میں مایوس نہیں ہوں جناب...... پر کیا کروں......'' وہ روہانسی آواز میں بولا۔ ''صندل کا چہرہ بار بار نگاہوں کے سامنے گھوم جاتا ہے۔''

''ایک سراغ ملا ہے مجھے......!'' میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔

''سراغ......!'' اس کی ویران آنکھوں میں چمک ابھر آئی۔ ''کیسا سراغ تھانے دار صاحب۔'' وہ سرسراتی ہوئی آواز میں بولا۔ ''کیا آپ نے میری صندل کا پتا چلا لیا ہے؟''

''کسی حد تک یہ بات کہی جاسکتی ہے۔'' میں نے... بہ دستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''بجھارتیں نہیں ڈالیں تھانے دار صاحب!'' وہ اضطراری لہجے میں بولا۔ ''بتائیں، آپ کو صندل کے بارے میں کون سا سراغ ملا ہے۔ میرے...... میرے دل کو کچھ ہو رہا ہے......''

''جب ڈاکو تمہارے کوارٹر میں گھسے تھے تو انہوں نے کسی تاجا اور نیلی پوٹلی کا ذکر کیا تھا۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''کیا تھا یا نہیں؟''

''جی...... کیا تھا......'' وہ الجھن زدہ انداز میں مجھے تکنے لگا۔

''نیلی پوٹلی تو ابھی تک معمہ بنی ہوئی ہے۔'' میں نے نفسیاتی حربے کو دھیرے دھیرے آزمانے کا عمل جاری رکھا۔ ''لیکن میں نے تاجا کا کھوج لگا لیا ہے......''

''کک...... کون ہے وہ......؟'' وہ ہکلا کر رہ گیا۔

''تم بھی اسے جانتے ہو۔'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔

''م...... میں......'' اس کی آنکھوں میں الجھن تیرنے لگی پھر فیض محمد کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''تھانے دار صاحب کیا کہہ رہے ہیں......؟''

میں نے اللہ رکھا کی آمد کی اطلاع کے ساتھ ہی صندل کی تصویر کو اپنی میز کی دراز میں رکھ دیا تھا۔ میں نے مذکورہ تصویر اللہ رکھا کو دکھانے کے لیے دراز کی جانب ہاتھ بڑھا دیا۔

فیض محمد نے اللہ رکھا کے سوال کے جواب میں کہا۔ ''پتا نہیں یار...... ابھی تمہارے آنے سے پہلے تھانے دار صاحب مجھ سے بھی یہی بات کر رہے تھے۔''

''یہ تصویر دیکھو اللہ رکھا۔'' میں نے صندل کی تصویر اس کی جانب سرکا دی۔

اس نے مذکورہ تصویر دیکھی تو بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔ ''یہ...... یہ تو میری بیٹی...... میری صندل کی تصویر ہے۔''

''تم نے اپنی بیٹی کی تصویر کو اچھی طرح پہچان لیا ہے نا......؟''

''جی...... صندل کو میں نہیں پہچانوں گا تو پھر کون پہچانے گا۔''

''پتا ہے، یہ تصویر مجھے کہاں سے ملی ہے؟''

''نہیں!'' وہ سوالیہ نظر سے مجھے تکنے لگا۔

''تاجا کے سامان میں سے۔'' میں نے نفسیاتی ٹریٹمنٹ جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''اب تم مجھے بتاؤ گے کہ تمہاری بیٹی کی تصویر تاجا کے پاس کیسے پہنچی، تم تو کسی تاجا کو جانتے ہی نہیں۔''

میری اس نوعیت کی پوچھ گچھ کا مقصد ہرگز اللہ رکھا کو ہراساں یا پریشان کرنا نہیں تھا۔ وہ بے چارہ تو پہلے ہی بے حد پریشان تھا۔ میں دراصل کوئی ایسا سراغ لگانا چاہتا تھا جو صندل کی تلاش میں میرے لیے مددگار ثابت ہوسکتا۔ ابھی تک جو حالات منظر پر آئے تھے، وہ میرے لیے اطمینان بخش نہیں تھے۔ یہ ٹھیک ہے کہ دو ڈاکوؤں نے، دو روز پہلے اللہ رکھا کی بیٹی صندل کو رات کی تاریکی میں اغوا کرلیا تھا۔ یہ حقیقت بھی واضح ہو چکی تھی کہ ڈاکو وہاں صندل کے لیے نہیں بلکہ کسی نیلی پوٹلی کی تلاش میں آئے تھے جو تاجا نے صندل کو دی تھی۔ صندل کو وہ پوچھ گچھ کرنے کے لیے اٹھالے گئے تھے اور جاتے جاتے یہ انکشاف بھی کر گئے تھے کہ تاجا بھی انہی کے پاس ہے۔ اس صورت حال میں صندل کے ساتھ کسی مرد کا کنکشن لازمی ٹھہرتا تھا چاہے وہ تاجا ہو یا اچھو۔ صندل کی تصویر کا اچھو کے سامان سے برآمد ہونا اور صندل

کے اغوا سے ایک دن پہلے اچھو کا غائب ہو جانا اس زنجیر کی کڑیوں کو ملاتا نظر آتا تھا۔ اگرچہ ابھی تک میرے ہاتھ ایسا کوئی سرا نہیں لگا تھا کہ میں وثوق کے ساتھ کہہ سکتا۔ دراصل تاجا اور اچھو ایک ہی شخصیت کے دو نام ہیں۔

''لیکن یہ تاجا ہے کون جی؟'' اللہ رکھا کی چیخ سے مشابہ آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ ''اگر آپ نے اس کے سامان میں سے صندل کی تصویر ڈھونڈ نکالی ہے تو اسی سے کیوں نہیں پوچھتے کہ اس نے یہ تصویر کہاں سے حاصل کی۔ میں کسی تاجا کو نہیں جانتا......''

''یہی تو مصیبت ہے۔'' میں نے لہجے کی سنجیدگی کو برقرار رکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ سوال میں فی الحال تاجا سے کر نہیں سکتا کیونکہ......''

میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ کر اللہ رکھا کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیا۔ وہ اضطراری لہجے میں مستفسر ہوا۔ ''کیونکہ......کیا جی؟''

''کیونکہ......'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''وہ صندل کے اغوا سے ایک دن پہلے اچانک کہیں گم ہو گیا ہے۔ ان حالات میں ڈاکوؤں کی بات درست ہی نظر آتی ہے کہ تاجا ان کے پاس ہے۔''

''لیکن اس سارے معاملے سے میری صندل کا کیا تعلق ہے جی؟'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ''اسے کس جرم کی سزا دی جا رہی ہے؟''

''اللہ رکھا!'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''میں صرف صندل اور تاجا کے باہمی تعلق کی تصدیق چاہتا ہوں۔ باقی معاملے سے میں خود ہی نمٹ لوں گا۔''

''آپ قرآن پاک لا کر میرے سر پر رکھ دیں جناب۔'' وہ بے بسی سے بولا۔ ''میں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہہ سکتا۔ آپ کو یقین آئے یا نہ آئے، میں کسی تاجا سے واقف نہیں ہوں......''

''اچھو سے تو واقف ہونا......'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''آلو لڈو کھٹائی والے اچھو سے جو ادھر شاہ پور میں رہتا ہے؟''

''جی......جی...... اس کو تو میں اچھی طرح جانتا ہوں۔'' وہ جلدی سے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''بڑا ہی بیبا بندہ ہے وہ......''

''یہ بیبا بندہ صندل کے اغوا سے ایک دن پہلے گم ہو گیا تھا اور ابھی تک گمشدہ ہے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''صندل کی تصویر اسی کے سامان میں سے برآمد ہوئی ہے۔ آج صبح شاہ پور سے کبیر احمد اس کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرانے آیا تھا۔ یہ تصویر بھی اسی نے مجھے دی ہے۔''

''اوہ......!'' اللہ رکھا نے افسوسناک انداز میں گردن ہلائی۔ ''جبھی میں کہوں، وہ اتنے دن سے کہاں غائب ہے۔ وہ تو روزانہ پھیری لگانے آتا تھا۔ ہم اس سے سموسے اور آلو لڈو کھٹائی والے خریدا کرتے تھے۔ بڑا ہی شریف اور بھلا مانس بندہ ہے جی۔''

اللہ رکھا نے ایک بار پھر اچھو کی تعریف کی تو مجھے یہ سمجھنے میں ذرا بھی وقت محسوس نہ ہوئی کہ اچھو صندل کے ساتھ ساتھ اللہ رکھا کو بھی اپنے شیشے میں اتار چکا تھا۔ خاصا کاریگر معلوم ہوتا تھا۔

''تمہارا یہ بیبا بندہ اچھو بڑی بیبائی سے تمہاری بیٹی صندل کے ساتھ محبت کا کھیل کھیل رہا تھا اللہ رکھا......'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''اور مجھے شک ہے کہ وہ اچھو نہیں

بلکہ.....تاجا ہے!''

''جی.....یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟'' وہ حیرت بھری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''میری تو اس سے اکثر بات ہوتی تھی۔ وہ مجھے اپنے اور اپنے باپ کبیر احمد کے بارے میں بتاتا رہتا تھا۔ وہ تاجا کیسے ہوسکتا ہے؟ آپ کی بات کو میں بالکل نہیں سمجھ سکا جناب.....!''

''میں سمجھاتا ہوں۔'' میں نے بڑی رسان سے کہا۔ ''پہلے یہ بتاؤ کہ تمہیں یقین ہے، اچھو کبیر احمد ہی کا بیٹا ہے؟''

''جی، اچھو نے مجھے یہی بتایا تھا۔''

''وہ کب سے ادھر پھیری لگانے آرہا ہے؟''

''کوئی سال، سوا سال ہوا ہے جناب۔'' اس نے بتایا۔

''اچھو کی عمر کے بارے میں تمہارا کیا اندازہ ہے اللہ رکھا؟''

''یہی جی پچیس اور تیس کے درمیان ہوگی اس کی عمر۔'' اس نے جواب دیا۔

''وہ سال، سوا سال سے سموسے اور آلو لڈو کھٹائی والے بیچ رہا تھا۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''اس سے پہلے وہ چوبیس سال کیا کرتا رہا ہے؟ اس کے بارے میں بھی اچھو نے تمہیں کچھ بتایا کہ نہیں؟''

''نہیں جی۔'' اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ ''نہ میں نے پوچھا اور نہ ہی اس نے بتایا۔''

''تم پوچھتے بھی تو وہ کبھی نہ بتاتا۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''کیونکہ وہ سال، سوا سال پہلے ہی شاہ پور پہنچا تھا اور کبیر احمد کا بیٹا بنا تھا۔''

''بیٹا بنا تھا؟'' اس کی آنکھوں میں الجھن نمودار ہوئی۔ ''کیا وہ کبیر احمد کا بیٹا نہیں ہے؟''

''نہیں؟'' میں نے اٹل لہجے میں کہا۔ ''یہ ساری کہانی کبیر احمد مجھے سنا گیا ہے اور مجھے یقین ہے وہ اچھو نہیں بلکہ وہی تاجا ہے جسے ڈاکوؤں نے صندل سے ایک دن پہلے گم کر دیا تھا۔ وہ تاجا سے کسی نیلی پوٹلی کو حاصل کرنا چاہتے تھے۔ یقیناً اس نے ڈاکوؤں کو بتایا ہوگا کہ اس نے نیلی پوٹلی صندل کو دی ہے جبھی انہوں نے تمہارے کوارٹر پر دھاوا بولا تھا اور پوٹلی کی تلاش میں ناکامی کے بعد وہ تمہاری بیٹی کو اٹھا کر لے گئے ہیں۔''

''او میرے خدایا.....!'' وہ دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کو تھامتے ہوئے بولا۔ ''میں..کس مصیبت میں پھنس گیا ہوں۔''

''تم پر یہ مصیبت تمہاری بیٹی کی وجہ سے نازل ہوئی ہے اللہ رکھا!'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''صندل نے غلطی یا نادانی میں ایک ایسے آدمی سے دل لگا لیا ہے جو خطرناک ڈاکوؤں کو مطلوب تھا۔ بس، یہ سب اسی دل لگی کیا دھرا ہے۔ اچھو تمہارے ساتھ اسی لیے میٹھی میٹھی باتیں کیا کرتا تھا کہ صندل کے ساتھ اس کا معاملہ چل رہا تھا۔''

''اب..... اب کیا ہوگا جی؟'' اس نے متفکر انداز میں مجھے دیکھا۔

''سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' میں نے بدترین حالات میں بھی پورے یقین کے ساتھ اسے تسلی دی۔ ''تم پریشان نہ ہو اور جا کر اپنی گھر والی کو بھی تسلی دو۔ میں انشاءاللہ! بہت جلد صندل کو ڈھونڈ نکالوں گا۔''

''اللہ آپ کو حیاتی دے جی۔'' وہ دعائیہ انداز میں بولا۔

میں نے کہا۔ ''اردگرد کے گاؤں دیہات میں تو تلاش کرلیا گیا ہے۔ اب میں اپنی تفتیش کا دائرۂ کار بڑھا رہا ہوں۔ ڈاکو کہیں بچ کر نہیں جاسکتے۔''

تھوڑی دیر کے بعد میں نے اللہ رکھا اور فیض محمد کو تسلی دلاسا دے کر تھانے سے رخصت کر دیا۔

مجھے یہ تسلیم کرنے میں کوئی عار نہیں کہ پچھلے تین چار روز میں، میں نے صندل اور ڈاکوؤں کی تلاش کے سلسلے میں جو بھی کارروائی کی تھی، وہ بے نتیجہ ثابت ہوئی تھی البتہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس دوران میں ''اچھو آلو لڈو کھٹائی والے'' کے حوالے سے جو انکشافات ہوئے تھے، چاہے وہ صندل کے بارے میں ہوں یا کبیر احمد سے متعلق، وہ دلچسپ اور سنسنی خیز تھے اور انہی انکشافات نے مجھے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا کہ کہیں..... اچھو وہی تاجا تو نہیں جس کی ڈاکوؤں کو تلاش تھی۔

اس رات سونے سے پہلے میں نے یہ فیصلہ کرلیا کہ اگلے روز میں ایک دو اہلکاروں کو ساتھ لے کر خود تھانے سے نکلوں گا پھر جو اللہ کو منظور ہو.....

☆☆☆

آئندہ روز مطلع ابر آلود تھا تاہم ابھی آسمان نے رونا دھونا شروع نہیں کیا تھا۔ میں تیار ہو کر اپنے کمرے میں آیا اور کانسٹیبل محمود کو اپنے پاس بلالیا۔ محمود نہایت ہی چاق و چوبند اور ذہین اہلکار تھا۔ میں اس کی معاملہ فہمی کا بھی قائل تھا۔

''جی ملک صاحب.....!'' وہ میرے پاس آکر شائستگی سے بولا۔

''ہمیں ابھی اور اسی وقت نکلنا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''تم ضروری تیاری کرلو۔ تم بھی میرے ساتھ جاؤ گے۔''

واپسی شام تک ہوگی۔''

''جانا کہاں ہے ملک صاحب؟'' محمود نے پوچھا۔

''منزل کا تعین بعد میں کریں گے البتہ مقصد طے شدہ ہے، صندل اور ڈاکوؤں کی تلاش۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''ہمیں سڑک سے ہٹ کر کھیتوں اور کھلیانوں میں بھی سفر کرنا ہوگا لہٰذا میرا خیال ہے کہ گھوڑوں کی سواری زیادہ موزوں رہے گی۔''

''ٹھیک ہے جناب۔'' وہ اپنے سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولا۔ ''میں دس پندرہ منٹ میں دو صحت گھوڑوں کا بندوبست کر دیتا ہوں۔''

''گھوڑوں کے ساتھ ہی اس امر کو بھی یقینی بنانے کی ضرورت ہے کہ اگر اچانک بارش شروع ہو جاتی ہے تو ہمارے پاس بچاؤ کا کیا انتظام ہوگا؟''

''جی، میں سمجھ گیا۔'' وہ جلدی سے بولا۔ ''آپ بے فکر ہو جائیں۔''

میں محمود کی طرف سے بے فکر ہو گیا اور حوالدار ارشاد کو اپنے پاس بلا لیا۔ میں نے اسے بتایا کہ آج کا پورا دن میں تھانے سے باہر رہوں گا لہٰذا میری غیر موجودگی میں تھانے کا انتظام اس کے ہاتھ میں ہوگا۔ ارشاد نے مجھے یقین دلایا کہ وہ مجھے کسی شکایت کا موقع نہیں دے گا۔ ارشاد ایک ذمے دار شخص تھا۔

لگ بھگ دس بجے میں اور کانسٹیبل محمود دو گھوڑوں پر سوار ہو کر تھانے سے نکل پڑے۔ آسمان پر گہرے بادل چھائے ہوئے تھے۔ ہلکی ہلکی ہوا بھی چل رہی تھی۔ فضا میں خنکی رچی بسی محسوس ہوتی تھی۔ اللہ رکھا اور اس کی گھر والی کی زبانی مجھے پتا چل چکا تھا کہ وقوعہ کی رات ڈاکو صندل کو اغوا کرنے کے بعد کس طرف لے گئے تھے۔ میں نے بھی اسی سمت میں سفر کا آغاز کیا۔

یہ ایک کچی سڑک تھی جو جنوب مشرق سے شمال مغرب کی طرف جاتی تھی۔ ریلوے پھاٹک سے لگ بھگ تین میل آگے جا کر یہ سڑک نہر کے اوپر سے گزرتی تھی اور اپنا رخ تبدیل کرتے ہوئے جنوب مغرب کی جانب مڑ جاتی تھی اور بالآخر لگ بھگ بیس میل آگے ایک سرحدی گاؤں چک چون پر جا کر ختم ہو جاتی تھی۔

میرے اور کانسٹیبل محمود کے درمیان صندل اور اچھو کے حوالے سے بات چیت کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ آلو لڈو کھٹائی والے اچھو سے وہ بھی واقف تھا تاہم اس کی چٹ پٹی اور مزے دار ''پروڈکٹس'' کھانے کا محمود کو کبھی اتفاق نہیں ہوا تھا۔

وہ لگ بھگ گیارہ بجے کا وقت تھا جب ایک عجیب وغریب واقعہ پیش آیا۔ ہم لوگ کچی سڑک پر کم وبیش دو میل کا سفر طے کر چکے تھے۔ یعنی نہر والے پل تک پہنچنے میں ایک میل کا فاصلہ باقی تھا۔ مجھے سامنے وہ کانسٹیبل آتا نظر آیا جسے میں نے صندل کی سابق سسرال یعنی جمال پور کی طرف روانہ کیا تھا۔ موضع جمال پور ریلوے پھاٹک سے تین میل کی دوری پر واقع تھا اور نہر کے پل سے اس کا فاصلہ لگ بھگ ایک میل کا رہا ہوگا۔

کانسٹیبل کا چہرہ تمتمایا ہوا تھا جو اندرونی جوش وخروش کی خبر دیتا تھا۔ ہمارے قریب پہنچ کر اس نے گھوڑا روک لیا اور باری باری ہم دونوں کو دیکھنے کے بعد بولا۔

''ملک صاحب! آپ کہاں جا رہے ہیں؟''

''ہم کہاں جا رہے ہیں یہ تو میں بعد میں بتاؤں گا۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''پہلے تم اپنی سناؤ...... میں نے تمہیں جس کام سے بھیجا تھا اس کا کیا ہوا...... اور یہ تمہارے حواس کیوں خطا ہو رہے ہیں؟ لگتا ہے، تم نے کسی بھوت کو دیکھ لیا ہے۔''

کانسٹیبل حفیظ میرا تبصرہ سن کر خجل سا ہوا پھر سنبھلتے ہوئے بولا۔ ''جناب! جس کام سے آپ نے بھیجا تھا اس کا تو کچھ پتا نہیں چلا مگر ادھر نہر کے پل کے قریب آج صبح ایک آدمی کی لاش ملی ہے۔ میں ابھی ادھر ہی سے آ رہا ہوں......''

میں چونک اٹھا اور پوچھا۔ ''کس کی لاش؟''

''ملک صاحب! اس آدمی کا نام اچھو ہے۔'' حفیظ انکشاف انگیز لہجے میں بولا۔ ''وہ بندہ جو ہمارے علاقے میں آلو لڈو کھٹائی والے بیچتا تھا۔''

''اوہ......!'' میں نے اور کانسٹیبل محمود نے یک بیک ایک دوسرے کو دیکھا پھر میں نے کانسٹیبل حفیظ سے پوچھا۔ ''میں نے تو تمہیں موضع جمال پور بھیجا تھا۔ تم نہر کے پل کی طرف کیا لینے گئے تھے......'' لمحاتی توقف کے بعد میں نے اضافہ کر دیا۔ ''ابھی تم نے بتایا ہے کہ جائے وقوعہ سے آ رہے ہو؟''

ریلوے پھاٹک سے نہر کا پل اور موضع جمال پور ایک جیسی دوری یعنی لگ بھگ تین میل کے فاصلے پر واقع تھے تاہم دونوں کی سمت اور رخ میں اچھا خاصا فرق تھا اور جمال پور و نہر کے پل کے بیچ کم وبیش شمالاً جنوباً ایک میل کا فاصلہ حائل تھا۔ جمال پور سے ایک کچا راستہ نکل کر اسی کچی سڑک سے مل جاتا تھا جس پر اس وقت ہم کھڑے باتیں کر رہے تھے تاہم

کچی سڑک اور کچے راستے کا ملاپ پل سے آدھا میل پہلے ہی ہوجاتا تھا یعنی اگر ریلوے پھاٹک کی طرف سے آئیں تو لگ بھگ ڈھائی میل کے بعد سڑک سے وہ راستہ نکل کر جمال پور گاؤں کی طرف جاتا تھا۔ کانسٹیبل حفیظ میرے سوال کے جواب میں وضاحت کرتے ہوئے بولا۔

''ملک صاحب! بات دراصل یہ ہے کہ میں تو آج صبح جمال پور سے واپسی کے لیے روانہ ہوا تھا لیکن جب میں تھوڑا سا ہی آگے آیا تو مجھے پتا چل گیا کہ ادھر نہر والے پل کے قریب کھیتوں میں کسی بندے کی لاش پڑی ملی ہے۔ اندرونی تجسس مجھے کھینچ کر جائے وقوعہ کی طرف لے گیا۔ بس اتنی سی بات ہے......'' ذرا دیر کو رک کر اس نے ایک بوجھل سانس خارج کی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''جب میں وقوعہ پر پہنچا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہ لاش اچھو آلو لڈو کھٹائی والے کی تھی۔ اس علاقے میں اچھو کو کوئی نہیں جانتا لیکن میں نے فوراً پہچان لیا۔ وہ ہمارے علاقے میں چھابڑی سر پر اٹھائے ''آلو لڈو کھٹائی والے'' کی آوازیں لگاتا پھرتا تھا۔''

''تم اس کی لاش کو دیکھ کر فوراً یہ تو پہچان گئے کہ وہ اچھو تھا'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''لیکن تمہیں نہیں معلوم کہ وہ اچھو آلو لڈو کھٹائی والا نہیں بلکہ تاجا تھا...... وہی تاجا جس کی وجہ سے ڈاکوؤں نے اللہ رکھا پھاٹک والے کی بیٹی صندل کو رات کی تاریکی میں اغوا کرلیا تھا۔''

''ملک صاحب! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟'' حفیظ حیرت سے مجھے دیکھنے لگا۔

''میں بالکل ٹھیک کہہ رہا ہوں۔'' میں نے ٹھوس انداز میں کہا۔ ''آؤ، جائے وقوعہ کی طرف چلتے ہیں۔ باقی کی باتیں بعد میں بھی ہوسکتی ہیں۔''

اس کے بعد ہم اپنے گھوڑوں کو دوڑاتے ہوئے نہر کے پل کی جانب بڑھنے لگے جو وہاں سے کم و بیش ایک میل کی دوری پر تھا۔ گزشتہ روز اچھی خاصی اور چمکیلی دھوپ نکلی تھی لہٰذا سڑک خشک ہوگئی تھی۔ اگر راستہ گیلا ہوتا تو ہمیں گھوڑوں کو بھگانے میں اچھی خاصی مشکلات پیش آسکتی تھیں۔

اگرچہ ابھی تک ایسا کوئی ٹھوس ثبوت یا واقعاتی شہادت میرے ہاتھ نہیں لگ سکی تھی جس کی بنیاد پر میں دعوے سے کہہ سکتا کہ اچھو اور تاجا ایک ہی شخصیت کے دو نام ہیں لیکن اندر سے مجھے یقین تھا کہ ایسا ہی ہے۔

جلد ہی ہم جائے وقوعہ پر پہنچ گئے۔ وہ مقام نہر کے پل کے قریب ہی کھیتوں میں واقع تھا۔ وہاں پر درجن بھر افراد بھی جمع تھے جو اپنی اپنی عقل کے مطابق چہ میگوئیوں میں مصروف نظر آتے تھے۔ میں نے سب کو پیچھے ہٹایا اور لاش کے معائنے میں مصروف ہوگیا۔

اچھو (تاجا) کا پورا بدن زخموں سے چور تھا۔ اسے بڑی اذیت دے کر موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ میں اس کی موت کے حوالے سے تفصیل میں نہیں جاؤں گا۔ بس اتنا ہی جان لینا کافی ہوگا کہ وہ بے بسی کی موت مارا گیا تھا۔ کانسٹیبل حفیظ اور محمود نے اسے اچھو آلو لڈو کھٹائی والے کی حیثیت سے شناخت کرلیا تھا۔

میں نے موقع پر موجود افراد سے بھی پوچھ گچھ کی۔ ان میں سے کوئی بھی اچھو کو نہیں جانتا تھا اور نہ ہی اس کی موت کے سبب سے واقف تھا۔ اچھو کی لاش کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ اسے پچھلی رات ہی سپردِ موت کیا گیا تھا۔

میں نے وقوعہ کی کارروائی نمٹائی اور اچھو کی لاش کو حفیظ کی ذمے داری میں تھانے بھجوانے کا بندوبست کردیا۔ مذکورہ لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے ضلعی اسپتال بھیجنا ضروری تھا اور اس کے لیے تھانے کے پاس ہی سے گزرنا پڑتا تھا۔ میں نے نہایت ہی سنجیدہ الفاظ میں کانسٹیبل کو ہدایات دیں۔

''حفیظ! تم اس بندے کی لاش کو تھانے پہنچاؤ اور اگر وہاں کبیر احمد موجود ہو تو اسے لاش دکھا دینا۔ اس کے بعد اسپتال لے جانا۔''

میں نے گزشتہ روز کی صبح جب کبیر احمد کو رخصت کیا تھا تو اس نے کہا تھا کہ وہ کل (یعنی آج) بھی تھانے کا چکر لگائے گا۔ میں نے ابھی اسی خیال کے تحت کانسٹیبل کو ہدایت دی تھی کہ ممکن ہے، جب حفیظ اچھو کی لاش کو لے کر تھانے پہنچے تو کبیر احمد وہاں موجود ہو۔

''ملک صاحب!'' حفیظ نے میری طرف دیکھتے ہوئے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔ ''آپ ہمارے ساتھ نہیں جائیں گے؟''

''نہیں......'' میں نے نفی میں گردن ہلائی۔ ''میں تھوڑی دیر کے بعد آؤں گا اور...... لاش کے ساتھ صرف تم جارہے ہو۔ محمود میرے ساتھ ہی واپس آئے گا۔''

اس نے بڑی فرماں برداری سے اثبات میں گردن ہلادی۔

لاش کو جائے وقوعہ سے ''روانہ'' کرنے کے بعد میں نے اِدھر اُدھر کا جائزہ لیا۔ چاروں جانب سرسبز وشاداب کھیت دکھائی دیتے تھے۔ وہاں سے نزدیکی گاؤں جمال پور ہی تھا جو نہر والے پل سے کم و بیش ایک میل کے فاصلے پر

واقع تھا۔ میرے ذہن میں کافی دیر سے یہ سوال چکرا رہا تھا کہ اچھو یا تاجا کی لاش کو وہاں پھینکنے والے کون تھے اور انہوں نے پچھلے دو ڈھائی دن اسے کہاں رکھا تھا؟ اگر آلو لڈو کھٹائی والے بیچنے والا اچھو ہی تاجا تھا تو یہ بات واضح ہو جاتی تھی کہ اسے بھی انہی ڈاکوؤں نے اغوا کیا ہوگا جنہوں نے مندل کو اغوا کیا تھا۔ میں موقع پر موجود لوگوں سے خاصی تفصیلی پوچھ گچھ کر چکا تھا۔ ان میں سے مقتول اچھو کو کوئی نہیں جانتا تھا اور نہ ہی متذکرہ بالا ڈاکوؤں سے کوئی واقف تھا۔

اچھو کی لاش کو دیکھ کر اندازہ ہو جاتا تھا کہ اسے پچھلی رات موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا اور اس کا قتل جائے وقوعہ پر نہیں ہوا تھا یعنی اسے کسی اور مقام پر قتل کرنے کے بعد وہاں لا کر پھینکا گیا تھا۔ اگر میں اس ''مقام'' کو ڈھونڈنے میں کامیاب ہو جاتا جہاں اچھو کو زندگی سے محروم کیا گیا تھا تو اس کے قاتلوں تک رسائی حاصل کرنے میں آسانی ہو سکتی تھی۔

کہتے ہیں کہ ڈھونڈنے سے تو خدا بھی مل جاتا ہے۔ ویسے مجھے اس محاورے سے کلی طور پر اتفاق نہیں کیونکہ ڈھونڈا صرف اسی شے کو جاتا ہے جو گم ہو گئی ہو۔ خدا کی ذات تو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ فرق صرف اتنا ہے کہ انسان اسے اپنی ذات سے باہر تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اگر کبھی کوئی خلوص نیت کے ساتھ ایک بار اپنے من میں جھانک کر دیکھ لے تو اس کی چشم بینا کو پھر کسی اور چیز کی حسرت نہیں رہے گی۔

بہر حال...... اس مقام کی تلاش بہت ضروری تھی جہاں پچھلے دو، ڈھائی دن سے اچھو آلو لڈو کھٹائی والے کو رکھا گیا تھا۔ میں نے گرد و پیش میں نگاہ دوڑاتے ہوئے کہا۔

''محمود! میں تھوڑا آگے جانا چاہتا ہوں۔''

کانسٹیبل محمود نے میری نگاہ کا تعاقب کرتے ہوئے یہ اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ میں کس جانب کا رخ کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ جب اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا تو مجھ سے پوچھا۔

''کس طرف جائیں گے ملک صاحب؟''

''جدھر یہ کچا راستہ لے جائے۔'' میں نے نہر کے پل کی سمت اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''آؤ میرے ساتھ۔''

''او کے ملک صاحب!'' اس نے اپنا گھوڑا میرے گھوڑے کے ساتھ آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

ہم گھوڑوں پر سوار، پہلو بہ پہلو سفر کرتے ہوئے نہر کے پل پر پہنچے پھر مذکورہ پل کو عبور کر کے آگے بڑھ گئے۔ اس کچی سڑک کا اختتام ایک سرحدی گاؤں چک چون پر جا کر ہوتا تھا۔ اس چک کے بعد دوسرا ضلع شروع ہو جاتا تھا۔ میرے تھانے سے یا یوں سمجھ لیں ریلوے پھاٹک سے چک چون لگ بھگ بائیس تئیس میل کے فاصلے پر واقع تھا۔

ہم اس سفر کے دوران میں بات چیت بھی جاری رکھے ہوئے تھے۔ محمود نے مجھ سے کہا۔ ''ملک صاحب! اگر ہم اسی سڑک پر آگے بڑھتے رہے تو شام تک چک چون پہنچ جائیں گے......''

''میرا چک چون جانے کا کوئی ارادہ نہیں ہے محمود!'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''بس تھوڑا گھوم پھر کر میں اس علاقے کا جائزہ لینا چاہتا ہوں۔ پھر ہم واپسی کا رخ کریں گے۔''

سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے خود کچھ پتا نہیں تھا کہ میں کہاں اور کیوں جا رہا ہوں۔ بس، اندر سے کوئی انجانی قوت سمجھا رہی تھی کہ مجھے جائے وقوعہ کے ارد گرد کے علاقے کا باریک بینی سے جائزہ لینا چاہیے اور میں یہی کر بھی رہا تھا۔

جائے وقوعہ سے کوئی دو فرلانگ آگے آئے تھے کہ کتوں کے بھونکنے کی آواز سن کر میں چونک اٹھا۔ گاؤں دیہات اور کھیت کھلیان میں کسی کتے کا بھونکنا کوئی اچنبھے کی بات نہیں تھی لیکن میرے چونکنے کا سبب ان کی آواز کی شدت اور تسلسل تھا۔ وہ مخصوص لَے کے ساتھ بھونک رہے تھے جیسے انہوں نے کوئی غیر معمولی شے دیکھ لی ہو اور انسانوں کو اس جانب متوجہ کرنے کی کوشش کر رہے ہوں۔

''محمود! یہ کیسی آواز ہے؟'' میں نے اپنے ساتھی کانسٹیبل سے استفسار کیا۔

''ملک صاحب...... یہ تین چار کتوں کے بھونکنے کی آواز ہے۔'' اس نے جواب دیا۔ ''یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ کسی فقیر کا پیچھا کر رہے ہوں۔''

اس نے کافی حد تک معقول جواب دیا تھا۔ کتے عموماً ایسا کرتے ہیں لیکن محمود کے جواب سے میری تسلی نہ ہو سکی اور میں نے اس جانب نگاہ اٹھاتے ہوئے الجھن زدہ لہجے میں کہا جدھر سے کتوں کے بھونکنے کی آواز آ رہی تھی۔

''نہیں محمود...... مجھے یہ کوئی اور ہی معاملہ لگتا ہے۔''

اس گفتگو کے دوران میں ہمارا سفر بھی جاری تھا۔ وہ متامل انداز میں مجھ سے مستفسر ہوا۔ ''کوئی اور معاملہ کیسا ملک صاحب؟''

''جب کتے کسی گداگر کے پیچھے لگ جاتے ہیں تو وہ ایک جگہ کھڑا ہو کر ان کی 'بھوں بھوں' نہیں سنتا۔'' میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''یا تو وہ انہیں اپنی لاٹھی دکھا کر بھگانے کی کوشش کرتا ہے یا پھر زمین سے کوئی پتھر وغیرہ اٹھا

کر مارتا ہے اور آگے بڑھ جاتا ہے۔ کتے یا تو اس کا تعاقب چھوڑ دیتے ہیں یا پھر بھونکتے ہوئے اس کے پیچھے اپنا سفر جاری رکھتے ہیں لیکن......'' میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''لیکن پچھلے دس منٹ سے، ایک ہی جگہ سے ان کے بھونکنے کی آوازیں ابھر رہی ہیں۔ کیا تم نے بھی یہ بات نوٹ کی ہے محمود......؟''

''آپ بالکل صحیح کہہ رہے ہیں ملک صاحب!'' وہ سرسراتی ہوئی آواز میں بولا۔ ''یہ بدبخت ایک ہی جگہ کھڑے بھونکے جا رہے ہیں......''

''ہمیں فوراً وہاں پہنچ کر ان کے بھونکنے کا سبب جاننا ہوگا۔'' میں نے اپنے گھوڑے کی رفتار بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''یہاں آس پاس کوئی آبادی نظر نہیں آرہی اسی لیے ابھی تک کسی نے ان کے بھونکنے کی طرف توجہ نہیں دی۔''

ہم تقریباً گھوڑوں کو بھگاتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ جلد ہی کھیتوں کے بیچوں بیچ میں ایک چھوٹی سی عمارت کو دیکھ کر چونک اٹھا۔ کتوں کے بھونکنے کی آواز بھی اسی سمت سے آرہی تھی۔ کچھ اور آگے بڑھنے پر واضح ہوا کہ وہ عمارت دراصل ایک کمرا تھا جو کچی سڑک سے تھوڑا ہٹ کر کھیتوں کے درمیان بنا ہوا تھا۔ کتے بھی، میرے اندازے کے مطابق، اس کمرے کے آس پاس ہی کہیں موجود تھے اور لگاتار بھونک کر کسی خاص معاملے کی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

اس صورتِ حال نے مجھے بے چین کر دیا۔ اندر سے مسلسل ایک آواز اٹھ رہی تھی کہ کسی سنسنی خیز منظر سے میرا واسطہ پڑنے والا ہے۔ ہم گھوڑے دوڑاتے ہوئے مذکورہ کمرے کے...... قریب پہنچے تو تین کتے بھی نظر آگئے جو کمرے کے دروازے کی طرف منہ اٹھا کر بھونکے جا رہے تھے۔ یہ مقام نہر والے پل سے لگ بھگ آدھ میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ ہم نے کچی سڑک کو چھوڑا اور کمرے کی جانب بڑھنے لگے۔

ہمیں اپنی جانب آتا دیکھ کر کتوں نے بھونکنا بند کر دیا اور تھوڑے فاصلے پر ہٹ کر کھڑے ہو گئے تاہم ان کی نگاہیں اب بھی کمرے کے دروازے پر جمی ہوئی تھیں اور وہ اپنی دموں کو اضطراری حرکت بھی دے رہے تھے۔ ہم کمرے کے سامنے جا کر رکے اور گھوڑوں سے نیچے اتر آئے۔

وہ نیچی چھت والا ایک عام سا کمرا تھا جس کا دروازہ نیم وا تھا۔ میں نے محمود کی طرف دیکھا اور کمرے کے دروازے کی جانب بڑھ گیا۔ میں جیسے ہی دروازے کے پاس پہنچا، میری سماعت نے سسکیوں کی آواز سنی۔ محمود بھی میری تقلید میں دروازے کے قریب پہنچ چکا تھا۔ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا تو وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

''ملک صاحب! کمرے کے اندر کوئی عورت مصیبت میں لگتی ہے......''

اس کا اندازہ درست تھا کیونکہ سسکیوں سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ ان کا مخرج کسی خاتون کے سوا اور کوئی ہو نہیں سکتا۔ عورت کا خیال آتے ہی میرا دھیان آپوں آپ اللہ رکھا کی مغوی بیٹی صندل کی طرف چلا گیا۔ میں نے سروس ریوالور نکال لیا اور گرج دار آواز میں پکارا۔

''کون ہے کمرے کے اندر......؟''

''م...... میں ہوں......'' کسی عورت کی پھنسی پھنسی آواز سنائی دی۔

ویسے تو کتوں کی مسلسل ''بھوں بھوں'' نے یہ راز کھول دیا تھا کہ کمرے کے اندر ایسا کوئی شخص موجود نہیں تھا جو آسانی سے حرکت کے قابل ہو ورنہ وہ باہر نکل کر انہیں دھتکار سکتا تھا لیکن پھر بھی احتیاط اور حالات کا تقاضا یہی تھا کہ اندر داخل ہونے سے پہلے تسلی کر لی جائے۔

''تمہارے ساتھ اور کتنے افراد ہیں؟'' میں نے تحکمانہ انداز میں پوچھا۔

گھٹی ہوئی آواز میں جواب دیا گیا۔ ''کک...... کوئی نہیں...... وہ لوگ چلے گئے ہیں...... خدا کے لیے مجھے...... یہاں سے نکالیں...... تم جو کوئی بھی ہو، تمہیں اللہ رسول کا واسطہ......''

''کیا تم اللہ رکھا کی بیٹی صندل ہو؟'' میں نے کمرے کے اندر قدم رکھنے سے پہلے پوچھا۔

''جی...... میں صندل ہی ہوں......!''

اگلے ہی لمحے میں کمرے کے اندر تھا۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ کانسٹیبل محمود مجھ سے پیچھے رہ جاتا۔ وہ بھی پلک جھپکتے میں میرے ساتھ کھڑا تھا۔ کمرے کے اندرونی منظر نے ہمیں شرمسار کر کے رکھ دیا اور ہم آنکھیں بند کرنے پر مجبور ہو گئے۔

کمرے کے فرش پر پرال بچھا کر اسے بیٹھنے اور سونے کے قابل بنایا گیا تھا اور اسی پرال پر کمرے کے ایک کونے میں صندل نیم برہنہ حالت میں پڑی تھی۔ اس کے

ہاتھ پاؤں کو مضبوط رسیوں سے باندھ کر اسے بے بس کر دیا گیا تھا۔ اس کے منہ پر بھی دوپٹے کی پٹی باندھی گئی تھی تاہم وہ پٹی اپنی جگہ سے کھسک گئی تھی جس کی وجہ سے وہ پھنسی پھنسی آواز میں بولنے کے قابل ہو سکی تھی۔

میں صندل کی طرف پشت کر کے کھڑا ہو گیا اور گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''صندل! میرا نام ملک صفدر حیات ہے اور میں تمہارے علاقے کا تھانے دار ہوں۔ پچھلے دو دن سے میں تمہیں تلاش کر رہا ہوں۔ ڈرنے یا خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ تم مجھے اپنا بڑا بھائی سمجھو اور آنکھیں بند کر لو۔ جب تک میں تمہارے ہاتھ پاؤں کی بندشیں نہیں کھولوں گا، تم اپنے بدن پر لباس کو درست نہیں کر سکو گی۔''

ایک لمحے میں، میری نگاہ نے جو منظر دیکھا تھا اس میں مجھے صندل نیم برہنہ ہی نظر آئی تھی۔ وہ کسی حد تک لباس میں تھی۔ اس کی پھنسی پھنسی آواز نکلی۔

''جی...... ٹھیک ہے......''

آئندہ پندرہ منٹ میں، میں نے کوشش کر کے صندل کے ہاتھ پاؤں اور منہ کو بندشوں سے آزاد کر دیا اور اس نے لباس کو اپنے بدن پر درست کر کے برہنگی کا دروازہ بند کر دیا۔ میرے ایما پر وہ کمرے کے دروازے تک چلی آئی۔ میں نے اسے پرال پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور تنقیدی نظر سے اس کا جائزہ لینے لگا۔ اس کی حالت خاصی نازک ہو رہی تھی۔ مجھے یہ اندازہ قائم کرنے میں کسی قسم کی دقت محسوس نہ ہوئی کہ ڈاکوؤں نے اسے زدوکوب کرنے کے علاوہ اس پر مجرمانہ حملے بھی کیے تھے۔ ہر قسم کی زیادتی کا نشانہ بننے کے بعد وہ اس قابل نہیں رہی تھی کہ میں فوری طور پر پوچھ گچھ شروع کر دیتا تاہم چند بنیادی نوعیت کے سوالات نہایت ہی اہم تھے۔ میں نے پوچھا۔

''وہ دونوں ڈاکو کہاں گئے جو تمہیں تمہارے گھر سے اٹھا کر لائے تھے؟''

''وہ دو نہیں، تین تھے۔'' صندل نے روہانسی آواز میں بتایا۔ ''ان کا ایک ساتھی یہاں موجود تھا۔ یہ تینوں آج صبح ہی یہاں سے گئے ہیں۔ سمجھیں کہ فجر کی اذان کے وقت۔'' وہ لمحے بھر کے لیے رکی پھر رو دینے والے انداز میں بولی۔ ''ان ظالموں نے مجھے کئی بار برباد کیا ہے اور...... اور...... میری آنکھوں کے سامنے اچھو کو بھی قتل کر ڈالا......''

''اچھو کی لاش مجھے نہر والے پل کے قریب سے مل گئی ہے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''لیکن ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ وہ اچھو کو تا جا کیوں سمجھ رہے تھے......؟''

میں نے اپنے ذہن میں موجود ایک نہایت ہی اہم سوال کا جواب لینا چاہا تو وہ جلدی سے بولی۔ ''تھانے دار صاحب! وہ لوگ اسے تا جا سمجھ نہیں رہے تھے بلکہ وہ تا جا ہی تھا، ان کا کوئی پرانا یار بیلی...... اس نے مجھے اپنا نام غلط بتایا ہوا تھا۔ میں نے ان کے درمیان ہونے والی باتوں سے اندازہ لگایا ہے کہ وہ سب جرائم پیشہ لوگ تھے......''

میں نے ایک گہری سانس خارج کی۔ گویا پچھلے دو تین دن سے میرے دماغ میں سنسنی خیز خیالات کی جو کھچڑی پک رہی تھی، وہ اب تیار ہو چکی تھی۔ میں جس رخ پر سوچ رہا تھا، صندل نے اس کی تصدیق کر دی تھی۔

''تفصیلی باتیں تو تھانے جا کر ہوں گی۔'' میں نے ہمدردی بھرے لہجے میں کہا۔ ''یہاں سے روانہ ہونے سے پہلے صرف اتنا بتا دو کہ وہ نامراد ڈاکو کس طرف گئے ہیں؟''

''میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتی تھانے دار صاحب۔'' وہ بے بسی سے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ''وہ جب یہاں سے نکلے تو رات کا وقت تھا۔ ان کے جانے کے دس پندرہ منٹ بعد ہی فجر کی اذانیں ہونے لگی تھیں۔ انہوں نے مجھے رسیوں سے اس طرح باندھ دیا تھا کہ میں اپنی جگہ سے ہل نہیں سکتی تھی۔ مجھے نہیں پتا، وہ کہاں گئے ہیں۔ میں تو دل ہی دل میں یہ دعائیں کر رہی تھی کہ اللہ جلد از جلد کسی کو اس طرف بھیج دے اور وہ مجھے اس مصیبت سے نجات دلا دے...... اللہ نے آخرکار میری دعا سن ہی لی......''

''وہ سب کی سنتا ہے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''وہ ہماری شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے۔ بس، اسے محسوس کرنے اور سمجھنے کی بات ہے۔''

وہ عقیدت بھری نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔

☆☆☆

میں نے صندل کو واپسی میں، اس کے گھر چھوڑ دیا تھا تاکہ وہ خود کو سنبھال سکے۔ پوچھ گچھ تو بعد میں بھی ہو سکتی تھی۔ وہ جس ذہنی، جسمانی اور جذباتی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو چکی تھی، اس میں اسے فوری طور پر راشد آرام کی ضرورت تھی۔ میں نے اسے ایک دن کے لیے سنبھلنے کا موقع دیا اور آئندہ روز آنے کا کہہ کر اس کے کوارٹر سے باہر نکل آیا۔

اگلے روز میں صندل کا بیان لینے کے لیے دوبارہ اللہ رکھا کے کوارٹر پر پہنچ گیا۔ صندل نے خود کو سنبھال لیا تھا۔ اللہ رکھا اور اس کی بیوی اپنی بیٹی کی زندہ سلامت بازیابی پر انتہا قدر خوش تھے کہ میرا شکریہ ادا کرتے ہوئے ان کی زبان تھکا

سو کر رہی تھیں۔ ننھا سلطان بھی تین راتیں اپنی ماں کے بغیر سویا تھا۔ اگرچہ وہ اپنی نانی سے زیادہ مانوس تھا تاہم ماں تو ماں ہی ہوتی ہے۔ وہ اس وقت ایک درخت کے نیچے بیٹھا مٹی سے کھیل رہا تھا۔

صندل نے اپنے بیان میں مجھے جو کچھ بتایا میں اس کا خلاصہ آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں تاکہ آپ کا ذہن بھی اس گتھی کو سلجھانے میں کامیاب ہوجائے۔ یہ ساری باتیں صندل نے ڈاکوؤں کی باہمی گفتگو سے اخذ کی تھیں۔ باقی میری ذاتی تحقیق و تفتیش کا نتیجہ ہے۔

اب یہ بات تو واضح ہوچکی تھی کہ اسلم عرف اچھو آلو لڈو کھٹائی والا درحقیقت تاج دین عرف تاجا ہی تھا۔ تاجا کوئی اچھا انسان نہیں تھا۔ کچھ عرصہ پہلے تاجا نے اپنے چار ساتھیوں کے ساتھ مل کر کسی دوسرے ضلع کے ایک گاؤں میں بڑی ٹھیک ٹھاک ڈکیتی ماری تھی جس میں ایک خطیر رقم کے علاوہ طلائی زیورات بھی ان کے ہتھے لگے تھے۔ یہ ڈکیتی اس گاؤں کے چودھری کی حویلی میں ماری گئی تھی۔ حویلی سے نہ صرف یہ کہ ڈاکوؤں کے خلاف بھرپور مزاحمت کی گئی بلکہ ان کا راستہ کھوٹا کرنے کے لیے ان پر فائرنگ بھی کی گئی تھی جس کے نتیجے میں تاجا کا ایک ساتھی مارا گیا تھا۔ تاجا اور دیگر تین ڈاکو ڈکیتی کے مال سمیت فرار ہونے میں کامیاب ہوگئے تھے۔

جائے واردات سے بہت دور نکل آنے کے بعد انہوں نے ایک محفوظ خفیہ مقام پر قیام کیا اور تازہ ترین صورتِ حال پر بات چیت کرنے لگے۔ تھوڑی دیر تک وہ اپنے جاں بحق ہونے والے ساتھی منظور عرف منظورے کے انجام پر افسوس کا اظہار کرتے رہے پھر ان کے لیڈر صمدو نے مالِ غنیمت کو حصہ بہ قدرِ مرتبہ تقسیم کرڈالا۔ سب کو رات اس محفوظ مقام پر گزار کر اگلے روز مختلف سمتوں میں الگ الگ روانہ ہونا تھا لیکن دوسری صبح جب وہ سو کر اٹھے تو ایک ناقابلِ یقین حیرت ان کی منتظر تھی۔

تاجا غائب ہوچکا تھا...... اور جاتے ہوئے وہ اپنے حصے کے علاوہ لیڈر کا حصہ (جو کہ سب سے زیادہ تھا) بھی چرا کر لے گیا تھا۔ اس صورتِ حال نے صمدو سمیت سب کو آگ بگولا کردیا تھا۔ انہوں نے مختلف سمتوں میں بکھرنے کے بجائے یکجا ہو کر تاجا کی تلاش شروع کردی۔ اس تلاش میں انہیں ایک سال سے زیادہ کا عرصہ لگ گیا بالآخر وہ اسے ڈھونڈنے میں کامیاب ہوگئے۔ وہ اب اسلم عرف اچھو کی حیثیت سے کبیر احمد کے گھر واقع شاہ پور میں رہ رہا تھا اور آلو لڈو کھٹائی والے بیچا کرتا تھا۔

ڈاکوؤں نے تاجا پر ہاتھ ڈالنے سے پہلے اس ویران کمرے کو اپنا مسکن بنایا جہاں سے میں صندل کو نکال کر لایا تھا پھر ایک رات انہوں نے تاجا کو زبردستی اغوا کرکے مذکورہ کمرے میں پہنچا دیا۔ وہ مقام پوچھ گچھ کے لیے بہت موزوں تھا۔ تاجا کی آلو لڈو کھٹائی والی چھابڑی کو ڈاکوؤں نے نہر والا پل عبور کرتے ہوئے نہر میں پھینک دیا تھا۔

پہلے تو صمدو اور اس کے دو ساتھیوں الیاس اور بھولا نے تاجا کی خوب درگت بنائی اور اس کے بعد پوچھا کہ...... بتا، تیری رضا کیا ہے...... شرافت سے ”مال“ کے بارے میں بتاتا ہے یا تیری کھال کھینچی جائے......؟

تاجا صورتِ حال کی سنگینی کو بھانپ چکا تھا۔ اس نے پنے تلے الفاظ میں اپنے بھائی بندوں پر واضح کرنے کی کوشش کی کہ اس کے اپنے حصے کے ساتھ ساتھ لیڈر کا چرایا ہوا مال بھی اس کے ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ کوئی اس سے بھی بڑا لٹیرا سب کچھ چھین کرلے گیا تھا اور...... اب اس کے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔

صمدو، الیاس اور بھولا کو تاجا کی کہانی پر یقین نہ آیا۔ وہ سمجھے، تاجا انہیں بے وقوف بنانے کی کوشش کررہا ہے لہٰذا انہوں نے جھنجلا کر اسے اور مارنا شروع کردیا۔ قریب تھا کہ وہ اسے جان ہی سے مار ڈالتے، اس نے انہیں بتایا کہ مال ایک نیلی پوٹلی میں بند ہے اور وہ پوٹلی اس نے صندل کے پاس رکھوائی ہوئی ہے۔ ڈاکوؤں نے اس سے صندل کا حدود اربعہ معلوم کیا اور صمدو اور الیاس نے گیارہ فروری کی رات اللہ رکھا پھاٹک والے کے کوارٹر پر دھاوا بول دیا۔ بھولا تاجا کی نگرانی کے لیے کمرے میں رک گیا تھا۔ انہیں نیلی پوٹلی کی تلاش تھی اور جب وہ اس تلاش میں ناکام رہے اور صندل نے بھی نیلی پوٹلی اور تاجا کے حوالے سے اپنی مکمل لاعلمی کا اظہار کیا تو وہ جھنجلاہٹ میں صندل کو اٹھا کرلے گئے تھے کہ باقی کی تفتیش وہ اس سے تاجا کے سامنے بٹھا کر کریں گے۔

صندل کو اس وقت حیرت کا شدید جھٹکا لگا جب اسے پتا چلا کہ اچھو دراصل تاجا ڈاکو ہے جو اپنے ساتھی ڈاکوؤں کو دھوکا دے کر شاہ پور میں چھپا بیٹھا تھا۔ بہرحال جب صندل اس کمرے میں پہنچی اور صورتِ حال ان ڈاکوؤں پر واضح ہوئی تو تاجا دوبارہ سے اپنے پہلے والے بیان پر آگیا کہ ڈکیتی کا سارا مال اس سے بھی بڑے کسی ڈاکو نے چھین لیا تھا۔ تاجا کے جواب نے ڈاکوؤں کے صبر و برداشت کے سارے بند توڑ دیے اور انہوں نے اذیت دے دے کر

تاجا کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ جب اس پر بھی ان کے انتقامی جذبات ٹھنڈے نہ ہوئے تو انہوں نے حسبِ توفیق صندل کو بھی پامال کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی اور ایک رات وہ صندل کو کمرے میں چھوڑ کر نامعلوم منزل کی جانب روانہ ہو گئے۔ اس سے پہلے وہ تاجا کی لاش کو پل کے قریب کھیتوں میں پھینک چکے تھے۔

صندل پچھلے دنوں وحشی ڈاکوؤں کے ہاتھوں جس عذاب سے گزری تھی، میں نے اس موضوع پر ایک لفظ بھی نہیں کہا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی صندل۔ اچھو یا تاجا، وہ جو کوئی بھی تھا، تم سے محبت کرنے لگا تھا اور تمہیں اپنانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ پھر اس نے کسی نیلی پوٹلی کے حوالے سے جھوٹ کیوں بولا......؟''

''تھانے دار صاحب! تاجا کے رویّے کو دیکھ کر تو میرا پیار اور محبت پر سے یقین ہی اٹھ گیا ہے۔'' وہ زخمی لہجے میں بولی۔ ''جو شخص اپنی جان بچانے کے لیے کوئی ایسا جھوٹ بول سکتا ہے جس کی وجہ سے میرے جسم و جان اور روح کا جنازہ اٹھ گیا، اس شخص کے پیار یا محبت کی کیا حیثیت باقی رہ جاتی ہے بلکہ اگر...... آپ کو برا نہ لگے تو میں ایک بات کہوں......؟''

بات مکمل کر کے اس نے سوالیہ نظر سے میری طرف دیکھا تو میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''ہاں...... بولو......''

''یہی بات تو یہ ہے تھانے دار صاحب......'' وہ اذیت بھری آواز میں بولی۔ ''میری نظر میں دنیا بھر کے مرد فریبی اور دھوکے باز ہوتے ہیں۔''

''صندل! میں تمہاری بات کا برا نہیں مناؤں گا۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''لیکن میں تمہارے تجزیے سے مکمل اتفاق نہیں کر سکتا۔ ہر انسان اپنے ذاتی تجربے اور مشاہدے کی روشنی میں بات کرتا ہے اور کسی ایک انسان کے تجربے یا مشاہدے کو فارمولا بنا کر تمام انسانوں پر لاگو نہیں کیا جا سکتا۔''

''آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟'' وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔

میں نے کہا۔ ''میں مانتا ہوں کہ تاجا ایک برا مرد تھا اور تمہارا سابق شوہر نیاز علی بھی کوئی اچھا مرد نہیں تھا۔ ان دونوں کے علاوہ دنیا میں اور بھی بہت سے برے مرد موجود ہیں لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اس جہان میں پائے جانے والے سارے کے سارے مرد ہی فریبی اور دھوکے باز ہیں۔ اچھے لوگ اگرچہ کم ہوتے ہیں مگر ضرور ہوتے ہیں اور مثبت و تعمیری عمل سے اپنی موجودگی کا یقین دلاتے رہتے ہیں۔''

''تھانے دار صاحب! آپ بڑی مشکل باتیں کرتے ہیں۔'' وہ دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کو تھامتے ہوئے بولی۔ ''میرے تو سر میں درد ہونے لگا ہے۔''

''صندل! فی الحال، میری باتوں پر زیادہ دھیان نہ دو۔'' میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ''اس وقت تمہیں زیادہ سے زیادہ اپنے پروردگار کا شکر ادا کرنا چاہیے جس کے کرم سے تم زندہ سلامت اپنے ماں باپ اور بچے تک پہنچ گئی ہو ورنہ وہ سفاک ڈاکو تمہیں بھی قتل کر کے تاجا کی طرح، تمہاری لاش بھی کھیتوں میں پھینک دیتے تو انہیں کون روک سکتا تھا۔ میں تو یہ سمجھ رہا ہوں کہ...... تمہاری کسی وقت کی کوئی نیکی کام آ گئی ہے......''

''میں نے ایک بار چوزوں والی مرغی کو ایک بدمعاش بلّے کے حملے سے بچایا تھا۔'' وہ سرسراتی ہوئی آواز میں بولی۔ ''اگر میں نے بروقت مداخلت کر کے اس بلّے کو نہ کھدیڑا ہوتا تو مرغی کے ساتھ ہی اس کے آٹھ دس ننھے منے چوزے بھی اس بلّے کے پیٹ میں چلے جاتے۔''

''بس، تمہاری یہی ادا اور اس بچوں والی مرغی کی دعا قدرت کو پسند آ گئی ہوگی۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اسی لیے آج ننھے سلطان کی ماں صندل بھی زندہ سلامت میرے سامنے بیٹھی ہے۔''

وہ عقیدت بھری نظر سے مجھے تکنے لگی۔

''میری ایک بات ذہن نشین کر لو صندل!'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''نیکی کسی سایہ دار درخت کے مانند ہوتی ہے جو سدا ہری بھری اور آباد رہتی ہے اور اپنے وجود سے زندگی بھر نیکی کرنے والے کو فیض پہنچاتی رہتی ہے۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ تمہاری وہ نیکی آباد ہے۔''

صندل نے اثبات میں سر ہلایا پھر گردن جھکا لی۔

صمد اینڈ کمپنی کو تلاش کرنے کے لیے میں نے حتی المقدور کوشش کی مگر مجھے کامیابی نہ مل سکی۔ یہی کہا جا سکتا تھا کہ وہ کسی دور دراز ضلع کی طرف نکل گئے ہوں گے۔ جلد یا بدیر ان تینوں کا انجام بھی اپنے ساتھیوں کی طرح عبرت ناک ہونا تھا...... منظورے اور تاجا کی طرح انہیں بھی ایک دن حرام موت ہی مرنا تھا، چاہے ان کی موت قانون کے رکھوالوں یا قانون شکنوں کے ہاتھوں ہوتی۔

(تحریر: حسام بٹ)